

مقررین و مصنفین کے لیے قابلِ قدر تحفہ

آداب تقریر و تصنیف

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ کتاب گھر
الکریم مارکیٹ ○ اردو بازار لاہور

مقررین و مصنفین کے لیے قابلِ قدر تحفہ

آداب تقریر و تصنیف

افادات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب

حضرت مولانا مفتی محمد زید مظاہری ندوی

ناشر

مکہ کتاب گھر، دوسری منزل الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

نام کتاب : ——— آداب تقریر و تصنیف

افادات : ——— حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ

مرتب : ——— مفتی محمد زید مظاہری ندوی

مطبع : ——— حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز۔ لاہور

اشاعت : ——— اکتوبر ۱۹۹۶ء

زیر نگرانی : ——— عبدالوحید اشرفی۔ محمد مشتاق

ناشر : ——— مکہ کتاب گھر دوسری منزل الکریم مارکیٹ

حق سٹریٹ اردو بازار۔ لاہور

قیمت : ———

عرض ناشر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم امابعد

آداب تقریر وتصنیف ـــــــــــــــ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ پاک نے حضرت حکیم الامت قدس سرہ سے دین کا جو عظیم الشان کام لیا اسی کا کرشمہ ہے کہ ان کے کئے ہوئے کام اور ان کے حالات بابرکات سے نجانے کتنے گلدستے تیار ہوئے اور کتنے تیار ہوں گے۔ یہ گلدستہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔

اللہ پاک جناب مفتی محمد زید صاحب (انڈیا) کو اپنی شایان شان جزائے خیر عطا فرمائیں کہ انہوں نے بکھرے ہوئے پھولوں کو یکجا کر کے یہ مہکتا ہوا گلدستہ تیار کیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء

طالب دعا محمد اسحاق

شعبان المعظم ۱۴۲۹ھ

آداب تقریر و تحریر

فن تقریر و تحریر کی اہمیت کا کون انکار کر سکتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی میرے بھائی ھارون فصیح اللسان سے قادر الکلام والبیان ہیں ان کو میرے ساتھ بھیج دیجئے۔

واخی ھارون ھو افصح منی لسانا فارسلہ معی (القرآن)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ان من البیان لسحرا۔ بعض بیان تو جادو ہیں۔ (الحدیث)

قلم و قرطاس دنیا کی پیدائش سے پہلے ہی علم کی حفاظت و اشاعت کا ذریعہ بن چکے تھے۔ الذی علم بالقلم قلم ہی ہے جس کے ذریعہ سے جہالت کو ختم اور ہدایت کو عام کیا جا سکتا ہے۔ علم الانسان مالم یعلم۔ الغرض دعوت و تبلیغ، دین کی نشر و اشاعت اور اہل باطل سے مقابلہ و مناظرہ کے لئے تقریر و تحریر، زبان و قلم کا سہارا لینا ناگزیر ہے اور زبان و قلم ہی اہل علم کا وہ ہتھیار ہے جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں کے قلوب مسخر اور تابع کر سکتے ہیں۔ باطل کو سرنگوں اور حق کو بلندی کے مقام تک پہنچا سکتے ہیں۔

لیکن ظاہر بات ہے لکل فن رجال ہر کام ہر ایک کے بس کا نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر ایک میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے۔ تقریر و تحریر وعظ و تصنیف کے مستحقین دراصل اہل علم و علماء ہی تھے اور یہ علماء کا منصبی فریضہ رہا ہے لیکن بدقسمتی سے اہل علم و اہل مدارس کی توجہ جب اس طرف سے کم ہونے لگی تو دوسروں نے قلم قرطاس سنبھالا اور بے لگام ہو کر اپنی زبان درازی کا مظاہرہ کیا اور ضلوا فاضلوا کا مصداق بنے۔

ضرورت تھی اس موضوع پر تفصیلی کلام تقریر و تحریر تصنیف و تالیف

کے آداب، اصول وضوابط اور اس کی اہمیت وضرورت کا احساس دلا کر اہل علم کو اس طرف متوجہ کیا جائے۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اپنی مختلف کتابوں نیز ملفوظات مواعظ میں اس موضوع پر کافی کلام فرمایا ہے جس کو ترتیب کے ساتھ اس رسالہ میں یکجا کر دیا گیا ہے۔

اس رسالہ میں تقریر وتحریر کی اہمیت، تقریر کا طریقہ، موضوع کا انتخاب، باکمال مصنف کے اوصاف اور اس جیسی ضروری باتوں نیز تقریر وتحریر کے مقاصد اور اس سلسلہ میں ہونے والی کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے۔

تصنیف وتالیف کی اہمیت، مسودہ تیار کرنے کا طریقہ، کتاب یا مضمون کے نام رکھنے سے متعلق ضروری ہدایت اور کامیاب تصنیف وتالیف اور اس کی تکمیل، ضروری اصول بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب اہل علم حضرات مصنفین و مؤلفین، مقررین اور واعظین کے لیے بہت ضروری ہے اس کے علاوہ طلباء کے لیے بھی مفید ہے۔

فقط۔ اقبال احمد قاسمی

معین مفتی دار العلوم دیوبند ۱۹ ۲/ ۱۴۱۲ھ

فہرست مضامین

تمت

باب ۱

تحریر و تقریر کی اہمیت

الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان ۝

ترجمہ :۔ رحمٰن نے قرآن سکھایا ۔ انسان کو پیدا کیا اس کو بیان سکھایا ۔ بیان میں تقریر و تحریر دونوں داخل ہیں چنانچہ اسی تعلق کے اعتبار سے قرآن شریف میں ایک مقام پر ارشاد ہے علّم بالقلم ۔ یعنی بیان کبھی تو بالبنان (یا ہاتھ ، انگلیوں پوروں یعنی قلم سے) ہوتا ہے اور کبھی باللسان (یعنی زبان سے) یہ دونوں قسمیں بیان ہی کی ہیں ۔

اور اس بیان کا نعمت ہونا دنیوی منافع کے اعتبار سے بھی ہے ۔ لیکن اس وقت دین کے منافع کا ذکر ہے ۔ جن کے اعتبار سے یہ بیان ایک بڑی نعمت دینیہ بھی ہے ۔ اور وہ یہ ہیں کہ آج ہم لوگوں میں جو علم موجود ہے اس کی بدولت خدا کے مقبول بندوں میں داخل ہو سکتے ہیں یہ نعمت بیانیہ ہی کی بدولت ہے ۔ کیونکہ اگر ہمارے حضرات سلف صالحین علوم کو بیان نہ کر جاتے تو ہم کو کچھ بھی خبر نہ ہو سکتی تھی ۔

اسی طرح اگر ہم نفع متعدی کا ثواب حاصل کرنا چاہیں تو اس کی بھی یہی صورت ہے کہ ہم تحریر و تقریر میں پوری مہارت پیدا کریں اور علوم دینیہ دوسروں کو پہنچائیں ۔

ہم نے بعضے ایسے اہل علم بھی دیکھے ہیں کہ جن کو تحریر و تقریر نہیں آتی سو ان سے بہت کم لوگوں کو نفع پہنچا ہے۔ (دعوات عبدیت ص۱۳۶ ج ۱۲)

تحریر کے مقابلہ میں تقریر زیادہ ضروری ہے

بہ نسبت تحریر کے تقریر میں مہارت پیدا کرنے کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ تحریر سے تو نفع خاص ہوتا ہے یعنی صرف طلبہ اور خواندہ (پڑھے لکھے) لوگوں کو اور تقریر کا نفع عام ہوتا ہے جن میں خاص بھی داخل ہیں۔ غرض بیان کی دو صورتیں ہیں ایک درس جس کا نفع خاص طلبہ کو ہے اور ایک وعظ جس کا نفع عوام کو ہے اور ان دونوں (قسموں) کا افادہ (فائدہ پہنچانا) اس پر موقوف ہے کہ قوت بیانیہ بقدر ضرورت حاصل ہو پس ہمارے طلبہ کو اس وقت ان دونوں کی تکمیل اور مشق کی ضرورت ہوئی۔ (دعوات عبدیت ص۱۲۷ ج ۱۲)

دو باتیں خیال میں آتی ہیں یا تو درس و تدریس شروع کریں یا وعظ کہیں اور ان دونوں میں وعظ ہی زیادہ مفید معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کا نفع عام ہوتا ہے اور جس بات کے لئے ضرورت دیکھی جائے وہی بیان کی جاسکتی ہے۔ لیکن وعظ گوئی بڑی محنت کا کام ہے۔ ضرورت دونوں کی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ مستقل درس کا شغل رہے اور کبھی کبھی وعظ بھی ہوا کرے۔ (حسن العزیز ص۲۴۰ ج ۴)

وعظ تقریر کا اپنا بڑا فائدہ

وعظ کی ایک خاص برکت ہے کہ اگر کسی رذیلہ سے بچنے کی ہمت نہ ہو اور وعظ میں اس سے دوسروں کو روک دیا جائے تو خود بھی طبیعت

میں اس سے رکنے کی ہمت ہو جاتی ہے۔ (کلمۃ الحق ص۱۱۶)

وعظ تقریر کے متعلق اہل علم کی کوتاہی

ایک کوتاہی تو وعظ نہ کہنے کی ہے۔ اکثر اہل علم کو دیکھا ہے کہ وعظ کے صرف تارک ہی نہیں بلکہ اس سے نفرت اور اس کی تحقیر کرنے والے ہیں اور اس سے عار کرتے ہیں اور وعظ کہنے کو شان علم کے خلاف سمجھتے ہیں اور یہ عظیم خطار ہے۔

تعلیم دین کا اصل طریقہ جس کے واسطے حضرات انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے یہی وعظ وارشاد ہے جس کے ذریعہ سے دین کی تبلیغ فرماتے تھے باقی درس وتالیف وغیرہ تو اس کے تابع ہیں کیونکہ سلف میں حفظ وتدوین کے اہتمام کیوجہ سے صرف زبانی روایت اور عام خطبات پر قناعت اور اعتماد کیا جاتا تھا بعد میں علوم کی حفاظت کے لیئے درس وتالیف کی ضرورت ہوئی پھر اس حفظ سے ظاہر ہے کہ مقصود وہی تبلیغ اور زبانی خطاب ہے جس کی عام قسم کو وعظ کہا جاتا ہے پس اس تمام تر درس وتالیف کے اشتغال سے مقصود بالذات وعظ ہی ٹھہرا پس مقصود بالذات کی اماتت (اس کو مردہ کرنا) کتنی بڑی خطار ہے۔ (حقوق العلم ص۹۳)

فرمایا کہ وعظ جس سے عام اصلاح ہو اس زمانہ میں میرے نزدیک نہایت ضروری کام ہے بلکہ درس وتدریس سے بھی زیادہ اہم ہے کیونکہ درس تدریس اسی (وعظ) کے لیئے ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت بھی اسی لیے ہوئی ہے۔ (مزید المجید ص۶۵)

میرے پاس روپے نہیں ورنہ کم سے کم ایک ہی واعظ بابرکت اور خوش بیان ملازم رکھ لیتا جہاں ضرورت ہوا کرتی اس کو بھیج دیا کرتا اگرچہ علماء

اس کام کو حقیر سمجھتے ہیں لیکن یہ تحقیر ایسی ہے جیسے کہ حکماء یونان انبیاء علیہم السلام کو حقیر سمجھتے تھے۔ (العبد الربانی ص۱۱۵)

مُصنفین اور واعظین کا ہونا فرض کفایہ ہے

وعظ وتقریر کرنے کا فقہی حکم

بقدر ضرورت علماء میں کچھ لوگ مصنف اور واعظ بھی ہونے چاہئیں کیونکہ یہ امور فرض کفایہ ہیں ہر کام کرنے والے ضرورت کے مطابق کافی مقدار میں ہونے چاہئیں علامہ بیہقیؒ نے حدیث لایزال طائفۃ من امتی علی الحق منصورین کی شرح میں لکھا ہے کہ اس سے کوئی خاص جماعت مراد نہیں بلکہ دین کی خدمتیں بہت سی ہیں ہر شخص ان میں سے جو خدمت بجالا رہا ہے وہ اس میں داخل ہے خواہ واعظ ہو یا مصنف یا فقیہ ہو یا محدث۔

اگر قصبہ میں بقدر ضرورت واعظ موجود ہوں تو دوسرے علماء پر وعظ کہنا واجب نہیں۔ ان کو درس وتدریس میں مشغول رہنا چاہیئے اور اگر واعظ کوئی نہ ہو تو مولوی صاحب کو اجازت نہیں کہ وہ صرف مدرس ہی بن کر رہیں بلکہ ضرورت کے وقت ان کو وعظ بھی کہنا چاہیئے۔ (العبد الربانی ص۱۱۵)

علماء کے کرنیکے کام اور وعظ وتقریر کی اہمیت وخصوصیت

تعلیم عام لفظ ہے اور اس کے چند افراد ہیں اور سب مطلوب ہیں۔ اور یہاں تعلیم سے زیادہ تر انذار و وعظ ہی مراد ہے جس کی دلیل دوسری آیات ہیں اور انبیاء علیہم السلام کا طرز تعلیم بھی۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ (چونکہ تعلیم عام ہے اور تدریس کے ضمن میں اس کا بھی تحقق ہو رہا ہے تو بہت سے بہت آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم سے بالکل کورے نہیں۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ تعلمون الکتاب پر ہمارا عمل کامل ہے، کیونکہ جب تعلیم عام ہے اور اس کے چند افراد ہیں اور سب مطلوب ہیں اور آپ نے صرف ایک فرد کو لے رکھا ہے تو کمال کہاں ہوا؟
یقیناً آپ اس کو نقص تسلیم کریں گے تو خیر اپنے آپ کو ناقص مان لیجئے کیا پھر نقص کا رفع کرنا ضروری نہیں؟ یقیناً ضروری ہے۔ الغرض تعلیم اپنے سب افراد کو عام ہے جو سب مطلوب ہیں۔ اب ان افراد کو سمجھئے۔ سو اس وقت اس کے چند افراد میرے ذہن میں ہیں ان کو عرض کرتا ہوں اور استقراءً وہ چار ہیں:۔
وعظ، تدریس، امر بالمعروف بخطاب خاص، تصنیف۔
علماء کو ان چاروں شعبوں کو اختیار کرنا چاہیئے اس طرح کہ طلباء کے سامنے تو مدرس بن کر بیٹھیں اور عوام کے سامنے واعظ ہوں اور خاص مواقع میں امر بالمعروف کریں۔ اور خاص مواقع سے مراد یہ ہے کہ جہاں اپنا اثر ہو وہاں خطاب خاص سے نصیحت کریں۔ کیونکہ ہر جگہ امر بالمعروف مفید نہیں ہوتا۔ اور بعض دفعہ امر بالمعروف کی وجہ سے مخالفت بڑھ جاتی ہے جس کا تحمل ہر ایک سے نہیں ہوتا۔ اور اگر کسی سے تحمل ہو سکے تو سبحان اللہ۔ وہ امر بالمعروف کریں مگر یہ ضروری ہے کہ اپنی طرف سے سختی اور درشتی کا اظہار نہ کرے اور شفقت سے امر بالمعروف کرے اس پر بھی مخالفت ہو تو تحمل کرے اور اگر تحمل کی طاقت نہ ہو تو خطاب خاص نہ کرے بلکہ خطاب عام پر اکتفاء کرے۔
غرض امر بالمعروف وہیں کرے جہاں قدرت ہو اور یہ (عمل) آج کل بالکل ہی متروک ہو گیا ہے۔ باپ بیٹے کو، استاد شاگرد کو، پیر مرید کو، آقا نوکر کو اور خاوند بیوی کو بھی تو امر بالمعروف نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ ایسے رشتے ہیں جن میں انسان کا پورا اثر ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑی کوتاہی ہے

جس کا ہم سے سوال ہوگا۔ تین کام تو یہ ہیں۔

چوتھا کام تصنیف کا ہے علماء کو ضرورت کے موقع پر تصنیف بھی کرنا چاہیے اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ سب کے سب مصنف اور واعظ ہو جائیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ بقدر ضرورت علماء میں کچھ لوگ مصنف اور واعظ بھی ہوتے چاہئیں۔ (حقوق و فرائض ص۱۱)

وعظ کی افادیت

وعظ میں خاص اثر ہوتا ہے جس سے عوام کی اصلاح زیادہ ہوتی ہے۔ نیز عوام کو اس سے وحشت بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ دلچسپی ہوتی ہے اور اس کا جلدی اثر ہوتا ہے تصنیف میں بھی وعظ کے برابر اثر نہیں ہوتا۔ تصنیف کا نفع عام نہیں۔ اور درس کا نفع تو بہت ہی خاص ہے کہ ایک جماعت تک محدود ہے۔ سب سے زیادہ عام نفع وعظ کا ہے کہ ایک گھنٹہ میں پانچ چھ ہزار کو نفع ہو جاتا ہے تو وعظ کا نفع اتم دائم و اسہل (یعنی زیادہ کامل اور عام اور آسان) ہے اس لیے اس کو ضرور اختیار کرنا چاہیے۔ (العبد الربانی ملحقہ حقوق و فرائض ص۱۱۵)

وعظ کی اہمیت اور علماء کی ذمہ داری

تعلّم سے مقصود تعلیم ہے اور تعلیم کی حقیقت [redacted] ہے جس کو دوسری آیات میں حق تعالےٰ نے "انذار" سے تعبیر کیا ہے۔ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم۔ (تفقہ فی الدین یعنی شریعت کا علم اور دین کی سمجھ حاصل کریں اور اپنی قوم کو انذار و تبلیغ کریں)۔ اور وہ اصل وعظ کا کام ہے۔ جو میں اس وقت آپ کے سامنے کر رہا ہوں جس سے آجکل علماء متنفر ہیں۔

اور اس کے اصل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا کیا طرز تھا کیا وہ کتابیں پڑھایا کرتے تھے ہرگز نہیں ان کی تعلیم کا طریقہ یہی وعظ تھا اور اصل مقصود یہی ہے مگر وعظ کہنے کے لیے ہم جیسوں کو ضبط علوم کی ضرورت ہے حضرات انبیاء علیہم السلام کے علوم وہبی تھے نہ ان کو کتاب پڑھنے کی ضرورت تھی نہ وہ اس کے محتاج تھے کہ کتاب سامنے رکھ کر دوسروں کو پڑھائیں کیونکہ وہ حقائق کو اصطلاحات کی مدد کے بغیر سمجھانے پر قادر تھے۔ وہ معقول کو محسوس بنا دیتے تھے اس لیے ان کو کتابیں پڑھنے اور پڑھانے کی ضرورت نہ تھی۔ پھر بعد میں صحابہ رضی اللہ عنہم بھی حضرات انبیاء علیہم السلام کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہ تھے۔ وہ بھی اس کے محتاج نہ تھے۔ بعد میں جب حفظ میں کمی آئی اور علوم دینیہ کی استعداد میں کمی آئی تو علوم کو کتابوں میں مدون کیا گیا۔ اور اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کتابیں پڑھی اور پڑھائی جائیں مگر اس کی ضرورت اس بات کے واسطے ہوئی کہ کتابوں سے علم حاصل کر کے عوام کو صحیح علوم کی تبلیغ کریں غلط سلط باتیں نہ بتائیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ کتابیں پڑھانے ہی کو مقصود سمجھ لو اور تبلیغ و انذار کو چھوڑ کر بیٹھ جاؤ۔ (حقوق و فرائض ص۱۱۲)

اصلی کام انبیاء علیہم السلام کا وعظ ہی ہے اور یہ پڑھنا پڑھانا تو اس کی مدد کے واسطے ہے۔ (ملفوظات خیرت ص۲۲ ج ۲)

علماء کو وعظ و تبلیغ کی ترغیب

علماء نے آج کل یہ کام بالکل چھوڑ دیا ہے جو انبیاء علیہم السلام کا کام تھا اس لیے آج کل واعظ جہلاء زیادہ نظر آتے ہیں علماء واعظ بہت کم ہیں تو آپ نے اصل مقصود کے علاوہ جس چیز کو مقصود بنا دیا تھا اس

کی بھی تکمیل نہیں کی اس کا بھی ایک شعبہ لے لیا یعنی تعلیم درسیات اور دوسرا شعبہ تعلیم عوام کا چھوڑ دیا۔

صاحبو! اگر علماء عوام کی تعلیم نہیں کریں گے تو کیا جہلاء کریں گے؟ اگر جہلاء یہ کام کریں گے تو وہی ہوگا جو حدیث میں اتخذوا رؤسا جہالا فضلوا واضلوا۔ کہ یہ جہلاء مقتداء و پیشواء شمار ہوں گے لوگ انہیں سے فتویٰ پوچھیں گے اور یہ جاہل خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

اس لیے علماء کو تعلیم درسیات کی طرح وعظ و تبلیغ کا کام بھی کرنا چاہیئے اور اس کا انتظار نہ کرو کہ ہمارے وعظ کا اثر ہوتا ہے یا نہیں اور کوئی سنتا بھی ہے یا نہیں اور سننے والا مجمع ہے یا ایک۔ (وعظ علم

(وعظ علم دالخشیۃ ص۲۳)

وعظ تقریر علماء کا منصبی فریضہ ہے

وعظ تو ہمارا فرض منصبی ہے یہ کام تو ہم کو آپ کی خواہش کے بغیر بھی کرنا چاہیئے۔ خوشامد کرنے کی کبھی عادت نہیں ہوئی۔

یہ ہمارا کار منصبی ہے اور ہم اور کسی کام کے تو ہیں نہیں اگر یہ بھی نہ ہوا تو ہمارا وجود عدم برابر ہے اور جب یہ ہمارا کار منصبی ہے تو اس کے لئے کسی کی خوشامد یا سفارش کا انتظار کرنا چہ معنی۔ اگر کوئی درخواست نہ کرے جب بھی ہم کو یہ کام کرنا ہے اور درخواست کرنے پر تو کسی طرح اس سے انکار نہ ہونا چاہیئے۔ (حسن العزیز ص۱۹۸، ص۲۴۱ ج ۴)

علماء کے وعظ نہ کہنے کا انجام

واقعی مسلمانوں کو اس بات نے بے حد تباہ کیا ہے کہ وعظ کہنے والے زیادہ جاہل ہیں اور علماء وعظ نہیں کہتے۔ اگر علماء واعظ ہوتے تو مسلمانوں کی حالت تباہ و برباد نہ ہوتی (علماء کے وعظ نہ کہنے) کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب جاہل لوگ علماء کے سامنے بھی غلط باتیں کہنے سے نہیں ڈرتے چنانچہ مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ دیوبند میں ایک شخص نے میرے سامنے طلبہ کے مجمع میں
یاایہا الذین اٰمنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ الیٰ قولہ تعالیٰ ان کنتم تعلمون کا ترجمہ یہ کیا کہ جب جمعہ کی اذان ہوا کرے تو گھروں اور دکانوں کو تالے موند (بند) کر نماز میں آجایا کرو۔ یہ اس نے تعلمون کا ترجمہ کیا تھا کہ تالے موند کر آجایا کرو اس نے تعلمون کو الف سے بدلا اور لام کے فتحہ کو دراز کیا تو تالا ہو گیا اس طرح سے یہ معنیٰ حاصل ہوگئے۔

اسی طرح ایک جاہل نے انا اعطینٰک الکوثر کا ترجمہ کیا تھا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ کو مثل کوثر کے دیا ہے اس احمق نے .... اعطینٰک میں کاف تشبیہ بتلایا اور ضمیر مفعول کو فعل سے الگ کر دیا۔

ایسے ہی کانپور کے ایک جاہل نے من شر الوسواس الخناس کی تفسیر یہ کی کہ وسواس تو شیطان کا نام ہے اور خناس اس کا بیٹا ہے پھر اس پر ایک حکایت گھڑی اور دیر تک بیان کرتا رہا۔

اس کا سارا الزام علماء پر ہے۔ جاہلوں کو وعظ کی جرأت اس لیے ہوئی ہے کہ علماء نے یہ کام چھوڑ دیا ہے۔ اگر علماء یہ کام کرنے لگیں تو جہلاء کا حوصلہ پست ہو جائے گا اور یہ بھی نہ ہو تو کم از کم عوام مسلمان ان کا بیان سننا چھوڑ دیں کیونکہ ان کو محقق اور جاہل کے بیان میں زمین اور آسمان کا فرق نظر آئے گا (العبد الربانی حقوق و فرائض صلا)

علما کو خلوت نشینی کے بجائے وعظ تبلیغ کرنا چاہیئے

فرمایا میں ہمیشہ علمار کو صوفیار پر ترجیح دیتا ہوں کیونکہ دین اور اس کے حدود کے محافظ علمار ہی ہیں۔ اسی لیے میں علمار کو خلوت نشینی پر اس کو ترجیح دیتا ہوں کہ وہ درس تدریس، وعظ تبلیغ یا تصنیف وفتاویٰ میں اپنا وقت زیادہ صرف کیا کریں۔ یہ میرا فیصلہ عقلی ہے ورنہ طبعی طور پر میں صوفیار سے عشق کرتا ہوں۔ (مجالس حکیم الامت ص۱۱)

وعظ و تقریر سے اہل مدرسہ، علمار اور طلبأ کی بے رغبتی کا نتیجہ

خطاب خاص کی طرح اس خطاب عام یعنی وعظ کے باب میں کس قدر کوتاہی ہے ہم لوگ جو پڑھے لکھے کہلاتے ہیں بس طالب علموں کو پڑھانے ہی کو بڑی معراج سمجھتے ہیں مگر جو اصلی غایت اور صحیح غرض تعلیم و تعلم سے ہے اور جو انبیاء علیہم السلام کا خاص کام ہے یعنی تبلیغ و اشاعت جو بذریعہ وعظ ہوتی ہے اس کا کہیں پتہ بھی نہیں بلکہ جو اساتذہ علامہ کہلاتے ہیں وہ اسے موجب تذلیل و تحقیر و باعث استخفاف اور ننگ و عار سمجھتے ہیں اور اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ وعظ کہنا جاہلوں کا کام ہے۔

بس جی جب تم نے اسے جاہلوں کا کام سمجھ کر چھوڑ دیا تو پھر جاہلوں ہی نے اسے لے لیا جنہیں معانی کا تو کیا خبر ہوتی الفاظ تک درست اور صحیح نہیں ادا کر سکتے۔ لوگوں نے وعظ کہتے دیکھ کر انہیں عالم سمجھ لیا اور عالم سمجھ کر وعظ کے بعد فتوے پوچھنے شروع کر دیئے یہ بیچارے عالم تو تھے نہیں مگر یہ کہتے شرم آتی کہ مجھے مسائل نہیں معلوم مجبوراً جو جی میں آیا بتا دیا

اور غلط سلط فتویٰ دیدیا۔

حدیث شریف میں ہے اتخذ الناس رؤساجهالا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا۔ کہ آخر زمانہ میں لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے جو بغیر علم کے فتویٰ دیں گے۔ خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کردیں گے۔

تو یہ نوبت کیوں آئی؟ صرف اس لیے کہ جن کا یہ کام تھا انہوں نے چھوڑ دیا اور اپنے لیے موجب استخفاف سمجھا حالانکہ یہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا اصل کام تھا۔ (التبلیغ ص۲۳ ج۲۰)

مدارس میں مقررین واعظین کا ضرور انتظام ہونا چاہیے

ہر اسلامی مدرسہ وانجمن کم از کم ایک واعظ بھی مقرر کرے اور یہ سمجھے کہ ضرورت تعلیم کے لئے ایک مدرس کا اضافہ کیا کیوں کہ جس طرح مدرسہ کے معلمین طلبہ کے مدرس ہیں۔ واعظین عوام کے مدرس ہیں اور اہل انجمن یہ سمجھیں کہ یہ عوام کی تعلیم کے لیے ان کی انجمن کی ایک شاخ ہے۔ (القول الجلیل ص۲۳)

میرے پاس روپیہ نہیں ورنہ کم از کم ایک ہی واعظ بابرکت اور خوش بیان ملازم رکھ لیتا جہاں ضرورت ہوتی بھیج دیا کرتا۔

میں نے اپنے تعلق کے بعض مدارس کو بار بار لکھا کہ جیسے آپ کے یہاں مدرسین کو تنخواہ ملتی ہے اور یہ تعلیم و تدریس گویا خاص تبلیغ ہے اسی طرح مدرسہ سے تبلیغ عام کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔ اور مدرسہ کی طرف سے تنخواہ دار مبلغ رکھے جائیں اور ان کو اطراف و جوانب میں بھیجا جائے اور ان کو تاکید کردی جائے کہ چندہ نہ مانگیں صرف احکام پہنچائیں مگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی حالانکہ اس سے بہت نفع کی امید تھی بلکہ اس سے چندہ بھی زیادہ وصول ہوتا۔ (القول الجلیل ص۲۳)

بڑے اداروں میں اونچے پیمانہ پر نظم

میری رائے ہے کہ (بڑے) مدارس اسلامیہ جیسے دیوبند، سہارنپور کی طرف سے ہر جگہ مبلغ رہیں۔ تمام ممالک کے ہر حصہ میں مستقل طور پر ان کا قیام ہو۔ باضابطہ نظم ہو اور دیگر ممالک میں مبلغ تیار کرکے بھیجے جائیں۔ (انفاس عیسیٰ۔ ص ۴۴۰ ج ۲)

ہر مدرسہ میں ایک واعظ ہونے کی ضرورت اور اس کا فائدہ

وعظ کو اس لیے بھی اختیار کرنا چاہیئے کہ جس چیز کو آپ آج کل مقصود سمجھے ہوتے ہیں یعنی درس و تدریس خود اس کے لئے بھی یہ بہت معین و مفید ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ علماء کو آج کل مدارس کی طرف بہت توجہ ہے اور ہونا بھی چاہیئے کیونکہ علوم اسلامیہ کے بقاء کی یہی صورت ہے اور اسی کے لئے وہ چندے وغیرہ کرتے ہیں اور مدارس کا زیادہ تر مدار چندہ پہ ہے اور چندہ دینے والے زیادہ تر عوام ہیں۔ تو علماء کو چاہیئے کہ عوام کو اپنی طرف مائل کریں۔
اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہر مدرسہ میں ایک واعظ صرف وعظ و تبلیغ کے لئے رکھا جائے جس کا کام صرف یہ ہو کہ احکام کی تبلیغ کرے اور اس کو ہدیہ لینے سے قطعاً منع کر دیا جائے اور استحباباً یہ بھی کہہ دیا جائے کہ مدرسہ کے لئے بھی چندہ نہ کرے۔ بلکہ اگر کوئی خود بھی دے تو قبول نہ کرے بلکہ مدرسہ کا پتہ بتلا دے کہ اگر تم کو بھیجنا ہو تو اس پتہ پر بھیج دو۔
واعظ کو محصل چندہ نہ ہونا چاہیئے۔ محصل چندہ اور لوگ ہوں گے۔ واعظ کا کام صرف وعظ کہنا ہو۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اس کے وعظ میں جب چندہ کا ذکر نہیں ہوگا تو بے غرض وعظ ہوگا اس کا مخاطب پر بڑا اثر ہوتا ہے پھر عوام کو

مدرسہ سے تعلق ہوگا کہ اس مدرسہ سے ہم کو دین کا نفع پہنچ رہا ہے اس کی امداد کرنا چاہیئے اور آج کل تو عوام کو یہ بڑا اعتراض ہوتا ہے کہ صاحب ہم کو مدرسہ سے کیا نفع بس عربی پڑھنے والوں ہی کو کچھ نفع ہوگا۔ اور واقعی ایک حد تک یہ اعتراض بھی صحیح ہے اس لیے جن عوام سے آپ چندہ لینا چاہتے ہیں ان کو بھی تو کچھ نفع پہنچا چاہیئے۔ جس کی صورت میں نے بتلا دی کہ ہر مدرسہ میں ایک واعظ صرف وعظ کے لئے ہونا چاہیئے۔ اگر ہر مدرسہ میں ایک ایک واعظ ہو جائے تو پھر دیکھئے عوام کو مدرسہ سے کیسا تعلق ہوتا ہے۔ اور چندہ کی بھی کیسی کثرت ہوتی ہے۔ یہ چلتے ہوئے نسخے ہیں اگر شبہ ہو تو تجربہ کر کے اس کے نفع کا مشاہدہ کر لیجئے۔ میں اہل مدرسہ سے کہتا ہوں کہ امتحان کے طور پر کچھ عرصے کے لیے اس پر عمل کر کے دیکھ لو اگر تمہارے مدرسہ کو اس سے نفع نہ ہو تو اس کام کو بند کر دینا ہر وقت تمہارے اختیار میں ہے۔

(العبد الربانی ملحقہ حقوق وفرائض ص۱۱)

دینی مدارس میں تحریر و تقریر سکھانے کا انتظام ضروری ہے

اکثر مدارس میں طلبہ کی تقریر و تحریر کا کوئی خاص انتظام نہیں۔ اس میں اہل علم کو عاجز ہونا ان کی منصبی خدمات کا ضعیف ہونا ہے اس لیے اس کا خاص انتظام و اہتمام ہونا ضروری ہے۔ (حقوق العلم ص۵۹)

اتنی ضرورت اس زمانہ میں ضروری معلوم ہوتی ہے۔ کہ دیگر عام تعلیم کی طرح خوش تحریری و خوش تقریری کی مشق کا اہتمام بھی مدارس میں بالالتزام کیا جائے اس طریقہ پر کردہ طلباء کا اختیاری امر نہ رہے بلکہ سب کو اس امر پر مجبور کیا جائے۔ (تجدید تعلیم ص۴۴)

طلباء کو تقریر کی مشق کرانے کی ضرورت

ایک مقدمہ تقریر کا اور ہے۔ یعنی تقریر کی مشق وہ بھی کیجئے۔ بحمد للہ آپ کے اساتذہ اہل بصیرت ہیں اور مدرسہ میں سامان (اسباب) بھی موجود ہے اس کو غنیمت سمجھئے اور ایسے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ ایسا سامان کہیں نہیں ملے گا اور وقت بھی (بعد میں) نہ ملے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مقدمات ہی کے اندر سارے اوقات کو ضائع کر دو بلکہ ہر چیز کو اپنے درجہ میں رکھ کر حاصل کرو اصل مقصود دین ہے۔ مگر اس کے مختلف طریقے ہیں۔

صاحبو! ایسا سامان آپ کو اور کہیں میسر نہ آئے گا اور وقت بھی نہیں ملے گا۔ اس وقت کو غنیمت سمجھو۔ (آج کل) اس کی بہت ضرورت ہے۔

ہمارا کمال اس وقت تک ہے جب تک مدرسے کے اندر ہیں۔ مدرسے کے اندر سب کچھ ہیں اور جہاں باہر نکلے تو کچھ بھی نہیں۔ (آداب التبلیغ ص۱۲۱)

تقریر سکھانے کا ایک طریقہ

میں نے اپنے یہاں یہ انتظام کیا ہے کہ اگر کوئی کافیہ پڑھنے والا ہے تو کافیہ ہی کا کوئی مضمون دے دیا کہ اس کی تقریر کرو۔ اگر مشکوٰۃ پڑھ چکا ہے تو کوئی حدیث اسی وقت دے دی کہ اس کی تقریر کرو۔ اس سے زبان بھی کھل جاتی ہے یعنی بولنے کا عادی ہو جاتا ہے اور پڑھانے کا ڈھنگ بھی آجاتا ہے۔ اور تعلیم کا نقصان بھی نہیں ہوتا۔ (کلمۃ الحق ص۱۲۴)

ایک بار مجھ سے درخواست کی گئی کہ طلباء جمعرات کو کچھ تقریریں کیا کریں

میں نے اس صورت سے منظور کیا کہ اپنی درسی کتابوں کو ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو جاؤ اور ان کے مضامین کی تقریر کرو، مقصود بھی حاصل ہو جائے گا اور مفاسد سے بھی محفوظ رہیں گے۔

تقریر میں محنت کرنے کے حدود

(بعض طلبہ) تقریر کی فکر میں درسیات کا مطالعہ نہیں کرتے۔ مضمون ہی تلاش کرتے رہ جاتے ہیں۔ اصل مقصود یعنی تعلیم چوپٹ ہو جاتی ہے۔
(کلمۃ الحق ص۱۲۴)

اس طرح تقریروں میں مشغول ہونے کا ادنیٰ مفسدہ یہ ہے کہ علوم میں اشتغال کم ہو جاتا ہے۔ ایک ہفتہ قبل کوئی مضمون تقریر کے لئے تجویز کیا جاتا ہے۔ ہفتہ بھر اس کی تیاری میں رہتے ہیں۔ نہ مطالعہ ہے نہ سبق میں حاضری کی پابندی۔ نہ حاضری کے وقت استاد کی تقریر کی طرف توجہ نہ بعد میں نظر ثانی، نہ تکرار۔ (قصد دیوبند ص۱۸)

تحریر و تقریر کیلئے طلباء کا انتخاب اور اس منصب پر مقرر کرنے کا طریقہ

تبلیغ احکام اور مخالفین کے مضامین کو تحریراً و تقریراً رد کرنے کے لئے ایسے منتہی طلبہ کو منتخب کیا جائے جن کے ظاہر و باطن میں کچھ تو دین کی طرف خاص میلان موجود ہو اور پھر ان کو حضرات اہل اللہ کی خدمت میں رکھا جائے جس سے ان کا اخلاص راسخ اور ان کے اخلاق کی درستی ہو

ان کی صحبت سے انشاء اللہ اخلاص کا کچھ حصہ ضرور مل جائے گا۔

حسبِ استعداد جب کافی مدت تک ان کی خدمت سے مستفید ہولیں تب ان کو تقریری وتحریری تبلیغ کے منصب پر مقرر کیا جائے۔ اس وقت ان کی تقریر وتحریر نئے پرانے کسی طرز کی بھی انشاء اللہ مفید ہی ہوگی۔ مضر نہ ہوگی۔ باقی جو لوگ اس کے بغیر آج کل کے مذاق کی تحریر و تقریر کے عادی ہو رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ ان کی بڑائی کا کچھ اثر تو بیوقوفوں پر ہو جاتا ہے لیکن اصلاح یا تبلیغ جو بتائی جاتی ہے اس کا اثر برائے نام ہی ہوتا ہے۔ (تجدید تعلیم وتبلیغ ص۳۳)

فارغ التحصیل طلبہ کو منصبِ وعظ کا مکلف بنادینا چاہئیے

علماء کو بطور مشورہ کے میری گذارش ہے کہ جو لوگ (طلباء) فارغین عن الدرسیات باحیا ہوں ان کو ابھی سے وعظ کہنے کی اجازت دے دی جائے۔ اصلاح کامل کا انتظار نہ کریں کیونکہ وعظ کہہ کر وہ بہت جلد اپنی اصلاح کرلے گا۔

غالب حالت یہی ہے کہ جس میں حیا، شرم کا مادہ ہوتا ہے وہ دوسروں کی تربیت کرتے ہوئے اپنی اصلاح بھی ضرور ہی کرتا ہے۔
(کیونکہ) وعظ یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کلام انشائی ہے لیکن صورۃً اس میں ایک قسم کا دعویٰ بھی ہے کہ ہم خود بھی اس پہ عامل ہیں۔ اس دعویٰ ضمنی کے اعتبار سے باحیا آدمی شرماتا ہے اور جلد اصلاح کر لیتا ہے اسی لیے بعض لوگوں کا طرز عمل دیکھا گیا ہے کہ جس کام کی ان کو ہمت نہیں ہوئی اس کے بارے میں ایک دو دفعہ وعظ کہہ دیئے جس سے شرما کر بہت جلد ہی خود بھی عامل ہو گئے۔

اور اس کا راز (سبب) یہ ہے کہ واعظ جس امر پر خود عامل نہیں ہوتا اس کے متعلق اگر وہ وعظ کہنے بیٹھتا ہے تو الفاظ میں شوکت وصولت نہیں ہوتی۔ اندر سے دل بجھنے لگتا ہے۔ (العبدالربانی ملحقہ حقوق دفرالفن ص ۹۶)

ایک بزرگ کے پاس ایک بڑھیا اپنے بچے کو لے گئی اور کہا حضرت یہ گڑ بہت کھاتا ہے ذرا آپ اس کو نصیحت کر دیجئے۔ انہوں نے کہا کہ کل آنا۔ کل سمجھا دوں گا۔ وہ اگلے دن بچے کو لے آئی اور آپ نے نصیحت کر دی وہ اس سے رک گیا۔

کسی خادم نے کہا حضرت یہ کونسا باریک مسئلہ تھا جس کے لئے آپ نے ایک دن کی مہلت مانگی تھی؟

فرمایا بات یہ ہے کہ کل تک میں خود اس مرض میں مبتلا تھا اس وقت میری نصیحت کا اثر نہ ہوتا کیونکہ زبان ہی نہ اٹھتی، اس لیے میں نے ایک دن کی مہلت مانگی تاکہ پہلے اپنی اصلاح کر لوں چنانچہ کل سے میں نے گڑ کھانا چھوڑ دیا ہے اور اس کا عزم کر لیا کہ آئندہ بھی نہ کھاؤں گا تو آج میرے بیان میں اثر تھا۔ الفاظ میں زور تھا۔

سو واقعی غیر کامل کے وعظ میں شوکت وصولت نہیں ہوتی پھر اگر اس میں حیا ہے تو اس کو انقباض کا احساس ہوگا پس وہ جلد اپنی اصلاح کر لے گا اس لیے باحیا کو وعظ سے نہ روکنا چاہیئے۔ دوسری بات اس میں اور بھی ہے جو ابھی ذہن میں آئی ہے کہ وعظ سے عمل کی ہمت ہو جانے کا سبب ایک فطری حیا ہے جیسا کہ مذکور ہوا۔ دوسرا یہ بھی ہے کہ وعظ کے ذریعہ سے جب اس نے اہل اسلام کی خدمت کی، ان کو احکام کی تبلیغ کی جس میں اہل اللہ بھی ہوتے ہیں تو یہ اہل اللہ اس سے خوش ہو کر دعا دیتے ہیں۔ اس کی برکت سے حق تعالیٰ اس کی بھی اصلاح کر دیتے ہیں کیونکہ ہر مجلس وعظ میں کوئی نہ کوئی ایسا ہوتا

ہے جو اللہ کے نزدیک مقبول ہوتا ہے۔ (العبد الربانی ص۹۶-العبد الربانی ص۹۹)

تقریر نہ آنے کا عذر، علماء کو تقریر سیکھنے کی آسان تدبیر

بعض علماء یہ عذر کر دیتے ہیں کہ ہم کو وعظ کہنا نہیں آتا۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کو عربی پڑھنا بھی کب آتا تھا یہ بھی تو محنت کرنے سے ہی آیا ہے۔ اسی طرح وعظ کہنے کا ارادہ کیجئے اور کچھ دنوں محنت کیجئے۔ یہ کام بھی آجائے گا۔

جس کی سہل تدبیر یہ ہے کہ شروع شروع میں طلباء کے سامنے مشکوٰۃ شریف وغیرہ لے کر بیٹھ جاؤ اور کتاب دیکھ کر بیان کرو۔ پھر کچھ دنوں میں بغیر کتاب کے بیان شروع کرو۔ اس طرح ایک دن خوب بیان کرنے لگو گے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ جاہلوں کو تو وعظ کی جرأت ہو اور علماء کو اس کی ہمت نہ ہو؟ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب جہلاً علماء کے سامنے بھی غلط باتیں بیان کرنے سے نہیں ڈرتے نہ (العبد الربانی ص۱۱۱)

کتاب دیکھ کر وعظ کہنا

فرمایا کتاب دیکھ کر وعظ کہنے کا معمول مولانا محمد اسحاق صاحب کا سنا ہے کہ وہ کتاب سے وعظ فرمایا کرتے تھے۔ اس صورت سے وعظ کہنے سے دماغ پر تعب نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے میں نے چند روز تک وعظ کی یہ صورت اختیار کی تھی کہ کتاب دیکھ کر بیان کر دیا کروں مگر اب دماغ اس کا بھی متحمل نہیں۔ (الافاضات ص۲۲۵ ج۲)

تحریری وعظ

فرمایا کہ تقریری وعظ ہی کو (صرف) وعظ نہیں کہتے بلکہ جو تحریری نصیحت ہو وہ بھی وعظ ہے۔ (حسن العزیز ص۸۲ ج۴)

ناقص العلم کو تقریر سکھلانے کا نقصان

یتیم بچوں کو تقریریں اور نظمیں سکھلا دیں یہ طریقہ بہت مضر ہے اس کے لئے یہ قانون مقرر کر دینا چاہیئے کہ جو کم از کم جلالین شریف اور مشکوٰۃ شریف پڑھے اُسے تقریر سکھلائی جائے۔ اور اس سے پہلے تقریر سکھلانے میں بڑا ضرر یہ ہے کہ اگر یہ علم میں ادھورا رہ گیا تو لوگوں کی خواہش کے موافق تقریر کر کے کمائے کھائے گا جس سے سخت گمراہی پھیلے گی۔ ہاں تفسیر و حدیث پڑھے تو اگر وہ کامل الاستعداد نہ ہو مگر حق تو ہے تقریر کرنے کا اور جو شخص تفسیر و حدیث نہیں جانتا اُسے تو حق ہی نہیں۔ اس حالت میں اگر انہیں تقریر سکھلا دی گئی یا نظمیں یاد کرا دی گئیں تو پھر ان سے محبت نہیں ہوگی بلکہ مولود شریف اور معراج شریف پر نذرانے ٹھہرا ٹھہرا کر کمائیں گے اور کھائیں گے۔

افسوس کوئی اصلاح کرنے والا نہیں۔ لوگ یہ الزام دیتے ہیں کہ علماء اصلاح نہیں کرتے میں کہتا ہوں کہ ان کی اصلاح تو عوام ہی کے ہاتھ میں ہے اگر یہ ایسے جاہلوں کے وعظ نہ سنیں تو یہ خود وعظ کہنا چھوڑ دیں مگر لوگوں کو خدا جانے کیا ہوا ہے کہ ایسے جاہلوں کے وعظ میں مزہ آتا ہے (اصلاح الیتامیٰ ص۳۹۳)

باب ۲

وعظ و تقریر کی فضیلت اور اس کا ثواب

حدیث میں آتا ہے کہ جب کہیں اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو فرشتوں کی ایک جماعت وہاں مجتمع ہو جاتی ہے پھر وہ ذاکرین کے اوپر سکینہ نازل کرتے ہیں۔ پھر وہ جب حق تعالےٰ کے پاس چلے جاتے ہیں تو وہاں سوال ہوتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ یا اللہ ہم نے ان کو آپ کا ذکر کرتے ہوئے چھوڑا۔ حق تعالےٰ سوال فرماتے ہیں کہ کیا انہوں نے ہم کو دیکھا ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ نہیں یا اللہ انہوں نے آپ کو نہیں دیکھا اگر دیکھ لیتے تو اس سے بھی زیادہ کوشش کرتے۔ پھر سوال ہوتا ہے کہ وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں فرشتے عرض کرتے ہیں کہ وہ آپ سے جنت اور آپ کی رضا طلب کرتے ہیں اور آپ کی ناراضگی اور جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ گواہ رہو ہم نے ان سب کو بخش دیا۔ اس پر بعض فرشتے کہتے ہیں کہ یا اللہ فلاں شخص تو ذکر کے قصد سے نہ آیا تھا ویسے ہی ان کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے اس کو بھی بخش دیا۔

یہ جماعت ایسی نہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا محروم ہو۔ یہ تو حدیث کا مختصر مضمون ہے۔

اور ظاہر ہے کہ وعظ کی مجلس بھی مجلسِ ذکر ہے۔ اس میں خدا تعالیٰ کے

احکام کا ذکر ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ذکر اللہ ہی ہے۔ ذکر اللہ فقط تسبیح و تہلیل (سبحان اللہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ) وغیرہ میں منحصر نہیں صاحب حصن حصین نے اس مسئلہ پر تنبیہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں بل کل مطیع اللہ فہو ذاکر۔ ہر شخص جو خدا کی اطاعت میں مشغول ہو۔ وہ ذاکر ہی ہے۔ اگر بیان سے دلچسپی بھی نہ ہو تو یہ نفع کیا تھوڑا ہے کہ وہ جتنی دیر مجلس وعظ میں بیٹھے رہیں گے اتنی دیر تک وہ ملائکہ کی صحبت سے مستفید ہوں گے اور ذاکر شمار ہوں گے اور رحمت و مغفرت کے مستحق ہوں گے (حقوق الدین ص۶۵ الکمال فی الدین)

وعظ میں نفع ضرور ہوتا ہے۔

وَ ذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ "آپ نصیحت کیجیے کیونکہ نصیحت ایمان والوں کو نفع دیتی ہے" اس آیت سے معلوم ہوا کہ وعظ مسلمانوں کو نفع دیتا ہے اور جب وعظ کا نافع ہونا حق تعالے نے بیان فرما رہے ہیں تو نعوذ باللہ یہ تو احتمال ہی نہیں ہو سکتا کہ حق تعالے کا بیان فرمایا ہوا کوئی امر خلاف واقع ہو اور میں تو کہتا ہوں کہ وعظ سے اگر توفیق ہو کر گناہ کم ہونے لگیں تو اتنا نفع کیا کم ہے بلکہ اور ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر گناہ ترک نہ ہوں محض توبہ کی توفیق ہو کر گزشتہ ہی گناہ معاف ہو جائیں تو خود یہ کتنا بڑا نفع ہے خواہ پھر گناہ ہی کیوں نہ کرنے لگیں۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی بخار میں مبتلا ہوتا ہے یا موسم میں کوئی اور شکایت ہو جاتی ہے تو ہم نے نہیں دیکھا کہ اس نے علاج نہ کیا ہو محض اس خیال سے کہ اگر اچھا بھی ہو گیا تو اگلے سال پھر بیمار ہو جاؤں گا۔ وہاں تو علاج کو نافع سمجھ کر کیا جاتا ہے مگر یہاں یہ خیال ہوتا ہے کہ ایسی توبہ سے کیا فائدہ کہ پھر گناہ ہو جاتے۔ اس

سے لے جب ساری عمر گذر چکے گی اس وقت توبہ کر لیں گے۔ سچ یہ ہے کہ ہم بھی نہیں سمجھتے کہ ہمارے اندر امراض بھی ہیں ورنہ امراض جسمانی کا سا معاملہ یہاں بھی ہوتا اور اس وقت وعظ کو سمجھ کر سنتے۔ اب یہ بات نہیں تو یہی وجہ ہے کہ وعظ کا نفع باقی نہیں رہتا۔

اگر کسی کو خارش کا مرض ہو جائے اور اس کو کوئی نسخہ بل جائے تو وہ بار بار اس کو ذہن میں رٹتا ہے تاکہ یاد رہے پھر اس کا استعمال کرتا ہے محض اس خیال سے کہ خارش برا مرض ہے۔ مگر (یہاں) ہماری یہ حالت ہے کہ ہم وعظ میں تدبر نہیں کرتے، سوچتے نہیں، ذہن میں مضامین کا تکرار نہیں کرتے۔ (اسی لیے کامل نفع نہیں ہوتا)۔ (حقوق الزوجین ص۳۰۱)

وعظ سننے سے پہلے تصحیح نیت کی ضرورت

وعظ سے جو اصل مقصود ہے اس کو وعظ سننے کے وقت پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ جس کی حقیقت میں بیان کرتا ہوں آپ کو اس کی نیت کر لینا چاہیئے۔ اور نیت فعل اختیاری ہے۔ آپ اس کو درست کر سکتے ہیں۔ اگر پہلے سے کوتاہی واقع ہوتی ہے تو اس وقت اس کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ وعظ ایک روحانی مطب ہے یعنی باطنی اصلاح کی تدبیروں کا نام ہے۔ جس سے باطنی امراض کا علاج ہوتا ہے۔ بس یہ حاصل ہے وعظ کا۔

آج کل وعظ سننے سے لوگوں کی غرضیں مختلف ہوتی ہیں۔ بعض کی غرض تو محض ادائے رسم ہی ہوتی ہے۔ بعض کی یہ نیت ہوتی ہے کہ وعظ ایک برکت کی چیز ہے اس کے ہونے سے گھر میں برکت ہو جائے گی۔ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا جائے گا لیکن وعظ کی اصلی غایت

تک لوگوں کی نظر ہی نہیں۔ اور اصلی غرض کا حاصل امراضِ روحانی کا معالجہ ہے یعنی اپنے امراض کو غور کر کے دیکھنا اور اس کی تدبیر کرنا اگر یہ نیت پہلے سے نہ کی ہو تو اب کر لینا چاہیے۔

وعظ گو تھوڑا ہی سُنا جائے مگر اس کو یاد کیا جائے اور اس کا ذہن میں تکرار و اعادہ کیا جائے تو جو سُنا جائے گا ضرور یاد رہے گا۔ پھر عمل کا اہتمام کیا جائے تو اس طریقہ سے دو چار وعظ میں اصلاح ہو سکتی ہے مگر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم تدبر نہیں کرتے، سوچتے نہیں۔ مضامین کا تکرار نہیں کرتے۔ (حقوق الزوجین ص۳۱)

وَعظ کے نافع ہونے کے شرائط۔

حق تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَہِیْدٌ ۔ جس کے قلب ہو یا کانوں کو متوجہ کرے مراد یہ کہ قلب کو حاضر کرے اور کان لگائے اس کے واسطے اس میں نصیحت ہے اور ایسے ہی شخص کو نفع بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر فرماتے ہیں وَ ذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ آپ نصیحت کیجیے کیوں کہ نصیحت ایمان والوں کو نفع دیتی ہے۔

اِس آیت سے معلوم ہوا کہ وعظ مسلمانوں کو نفع دیتا ہے اور جب وعظ کا نافع ہونا حق تعالےٰ بیان فرما رہے ہیں تو نعوذ باللہ یہ تو احتمال ہی نہیں ہو سکتا کہ حق تعالیٰ کا بیان فرمایا ہوا کوئی امر خلاف واقع ہو۔ مگر بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ قرآن شریف سے اس کا نفع ہونا معلوم ہوا مگر اس کے باوجود بعض جگہ اس کا نفع نہیں ہوتا۔ جواب اس کا یہی ہے کہ نفع کی وہی شرط ہے لمن کان لہ قلب او القی السَّمع۔ حقیقت

میں یہ شبہ قرآن شریف پر نہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ دوا نافع ہے سو اس قول کے معنی یہ ہیں کہ اس کا نفع بعض شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ سو اگر کہیں نفع ظاہر نہ ہو تو یہ نہیں کہ دوا نافع نہیں۔ نافع یقیناً ہے مگر شرائط کے فقدان کی وجہ سے اس کا نفع ظاہر نہیں ہوتا۔ بس جس طرح اطباء دوا کی خاصیت بیان کرتے ہیں اسی طرح حضرت حق تعالیٰ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعمال کی خاصیت بیان فرماتے ہیں۔ بس جیسے اس دوا کی غایت کا ظاہر ہونا مشروط ہے شرائط کے ساتھ اسی طرح (وعظ کے نافع ہونے) کے لیے بھی شرائط ہیں اور وہ شرائط حق تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں۔ اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَذِکْرٰی الخ اور بھی جا بجا قرآن شریف میں ان شرائط کو بیان کیا ہے۔ کہیں ہے یَتَدَبَّرُوْنَ کہیں ہے یَتَذَکَّرُوْنَ کہیں ہے یَتَفَکَّرُوْنَ کہیں ہے یَتَدَبَّرُوْٓا اٰیٰتِہٖ۔ کسی جگہ ہے۔ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ یہ آیتیں بتلا رہی ہیں کہ جو شخص سوچے، یاد رکھے، خیال کرے، قصد بھی کرے ہمت بھی کرے تو اس کو نفع ہوگا اور اگر کوتاہی ہو جائے تو توبہ کرے اور متوجہ ہو جائے مگر ہماری حالت یہ ہے کہ نہ سوچتے ہیں نہ یاد رکھتے ہیں۔ نہ قصد نہ ہمت نہ عمل۔ اس لیے نفع بھی نہیں ہوتا۔ سو نفع نہ ہونے پر تعجب کرنا ہی بے بنیاد ہے۔

وعظ کی حقیقت اور اسکے سننے کے مختلف اغراض

وعظ۔ درحقیقت روحانی امراض کا علاج ہوتا ہے یعنی اس کا حاصل ہوتا ہے کہ روحانی امراض کی تشخیص کی جائے اور پھر ان کا علاج بتلا دیا جائے۔ یہ میں نے اس لیے عرض کر دیا کہ سامعین کو یہ بات معلوم ہو

چاہئے کہ وعظ سننے کے وقت کیا نیت رکھیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ تتبع احوال سے یہ معلوم ہوا کہ وعظ سننے سے سامعین کی مختلف اغراض ہوتی ہیں اسی طرح واعظ کی بھی مختلف نیتیں ہوتی ہیں۔ بعض کی غرض وعظ سننے سے یہ ہوتی ہے کہ وہ واعظ کے بیان سے قابل اعتراض اجزاء کا انتخاب کریں مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں۔

بعضوں کی نیت یہ ہوتی ہے کہ تقریر سے لذت حاصل کریں گے اس میں شک نہیں کہ اللہ جل شانہٗ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اور اس کی شرح میں لذت ضرور ہے۔ لیکن ہر چیز کا اصلی موضوع علیحدہ ہوتا ہے۔ سو یہ دیکھو کہ اس کلام کی غرض کیا ہے لذت یا کچھ اور۔ سو اس کی نسبت ارشاد ہے کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا آیاتہ ولیتذکر اولوا الالباب۔ اس میں خدا تعالیٰ نے تصریحاً فرما دیا کہ یہ کتاب اس لیے نازل کی گئی ہے کہ اس سے علم و عمل کا فائدہ حاصل کریں لِیَدَّبَّرُوا میں علم کی طرف اشارہ ہے اور لِیَتَذَکَّر میں عمل کی طرف۔

بعضوں کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ہم کو اس مجلس کی شرکت سے ثواب ملے گا۔ بظاہر یہ غرض اور اغراض سے اسلم ہے مگر خوب سمجھ لو کہ اگرچہ وعظ میں شرکت سے اس پر ثواب مرتب ہو جائے گا لیکن اصلی غرض یہ بھی نہیں جیسا کہ اوپر آیت سے معلوم ہوا ہے۔ ثواب کے لئے دوسرے کام بہت ہیں۔ نماز۔ روزہ، تلاوت قرآن اگرچہ بے سمجھے ہی تلاوت ہو تو نفس ثواب کے لئے اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ قطع مسافت کر کے گھر سے وعظ کی مجلس تک آئے اور وقت صرف کرے۔ (دعوات عبدیت تکمیل الاسلام ص۵۴ ج۸)

وعظ کی صحیح غرض اور اس کے سننے کا طریقہ

پس معلوم ہوا کہ وعظ کی اصلی غرض یہ ہے کہ انسان یہ دیکھے کہ مجھ میں کیا کیا مرض ہیں جتنے امراض وعظ میں بیان کیے گئے ہیں ان میں سے میرے اندر کتنی پائی جاتی ہیں اور جو پائی جاتی ہیں ان کا علاج کیا ہے۔ اس مقصود کے سوا باقی سب خیالات غیر اصلی ہیں اور جب یہ معلوم ہو گیا تو اگر کسی وعظ میں ذرا بھی لذت نہ آئے تو اس کی پروا نہ کرنی چاہیئے۔ دیکھئے آپ نے کبھی طبیب سے نسخہ لکھوا کر یہ انتظار نہ کیا ہوگا کہ آپ کو اس میں لذت بھی آئی یا نہیں آئی۔ البتہ اگر کوئی صاحب فن خود نسخے کو دیکھ کر اس طرح لذت پائے (کذا فی الاصل) کہ کیسی دقائق کی رعایت اس میں رکھی گئی ہے تو دوسری بات ہے باقی نسخے کی اصلی غرض یہی ہوتی ہے کہ مرض وعلاج متعین ہو جائے اور علاج کرنے سے مرض کا قلع قمع ہو جائے پس یہی غرض وعظ میں بھی ہونی چاہیئے کہ ہم میں کیا کیا امراض ہیں اس کے سوا ساری اغراض کو فراموش کر دینا چاہیئے۔

قرآن مجید میں جو قصے مذکور ہیں ان میں سے بھی یہی غرض ہے کہ لوگ سابقین (پہلے لوگ) کی حالت پر اپنی حالت کو قیاس کریں اور دیکھیں کہ انہوں نے کیا کیا اور اس کا ثمرہ ان کو ملا۔ ہم ایسا کریں گے تو ہم کو بھی وہی ثمرہ حاصل ہوگا۔

اب معلوم ہو گیا کہ وعظ کی اصلی غرض کیا ہے یعنی جو کچھ بیان ہوا اس کو اپنی حالت پر منطبق کر کے دیکھنا اور میں درخواست کرتا ہوں کہ خدا کے لئے اس بیان کو اپنی حالت پر منطبق کر کے دیکھیئے۔

اِس وقت جو کچھ خرابیاں ہو رہی ہیں وہ سب اِسی سبب سے ہیں کہ ہم اپنی حالت کو نہیں دیکھتے جو کچھ سنتے ہیں اس کا مصداق دوسروں کو سمجھتے ہیں۔ یہ کبھی احتمال بھی نہیں ہوتا کہ ہم میں بھی یہ امراض ہوں گے
(دعوات عبدیت تکمیل الاسلام ص۱۲۵ ج ۸)

لذت کے واسطے لچھے دار تقریروں کے شائقین سے خطاب!

جو لوگ وعظ کو روحانی علاج سمجھ کر نہیں سنتے بلکہ لذت کے طالب ہوا کرتے ہیں وہ البتہ کل جدید لذید (ہر نئی چیز لذیذ مزیدار ہوتی ہے) اس قاعدہ سے نئے نئے مضامین کے طالب ہوتے ہیں کیونکہ مزا تو واقعی نئی باتوں میں ہے۔ پرانی باتوں میں کیا مزا۔ یہ بات صحیح ہے کہ لذت جدید ہی میں ہے اسی لیے لوگ لذت کے لئے وعظ سنتے ہیں۔ نئے مضامین کے منتظر رہتے ہیں مگر یہ ان کی غلطی ہے (کیونکہ) وعظ سے مقصود لذت نہیں۔ بلکہ امراض کا علاج (وعظ کا مقصود ہے اس لیئے) لذت کے طالب نہ ہوجئے بلکہ اصلاح حال کے طالب بن کر وعظ میں آیا کیجئے اور بیان کو اپنی حالت پر منطبق کر کے دیکھئے کہ بیان موقع کا ہے یا نہیں کیونکہ پرانی شئے اگر اپنے موقع پر ہو وہ بھی لذیذ ہوتی ہے۔ دیکھئے بارش حالانکہ ہر سال ہوتی ہے مگر جب موقع پر ہوتی ہے تو اس سے کتنی خوشی ہوتی ہے۔ اسی طرح کھانا ہم ہر روز کھاتے ہیں مگر وقت پر آتا ہے کہ خوب بھوک لگی ہو تو کتنا لذیذ معلوم ہوتا ہے گو نیا نہیں ہے اُس سے معلوم ہوا کہ کسی شئی کا جدید ہونا مطلوب

نہیں بلکہ موقع پر ہونا مطلوب ہے۔

غرض بیان سننے سے اپنی اصلاح کا قصد کرنا چاہیئے اور اس کو اپنی حالت پر منطبق کرنا چاہیئے حق تعالے نے بھی عاد و ثمود کے قصے بیان فرما کر ہم کو تطبیق کا (یعنی اپنی حالت پر منطبق کرنے اور موازنہ کرنے کا) حکم دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب (بے شک ان قصوں میں عقلمندوں کے لئے عبرت ہے)

(آداب انسانیت، وعظ اصلاح ذات البین ص۱۵۳)

دَورانِ وَعظ گفتگو کرنا جائز نہیں پوری توجہ کے ساتھ سُننا ضروری ہے۔

اِس وقت کچھ باتوں کی آواز آئی حضرت نے فرمایا کہ اس وقت باتیں نہ کرو بلکہ غور سے ہماری باتیں سنو! یہ کیا انصاف ہے کہ ہم تو تمہارے لیے اپنا وقت اور دماغ صرف کریں اور تم اس کی بے قدری کرو اور تھوڑی دیر کے لیے بھی تم اپنی باتیں ختم نہ کرو یہ تو تہذیب کے بھی خلاف ہے۔

دوسرے شریعت کے بھی خلاف ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ جس طرح خطبۂ جمعہ کا سننا فرض ہے اور اس وقت باتیں کرنا حرام ہے اسی طرح جس مجلس میں بھی احکام شرعیہ بیان ہو رہے ہوں وہاں خاموش رہنا اہل مجلس کے ذمہ لازم ہے۔ باتیں کرنے سے گناہ ہوتا ہے۔

تیسرے باتیں کرنے سے بیان بھی خبط ہو جاتا ہے۔ بیان کرنے والے کے ذہن میں مضامین کی آمد بند ہو جاتی ہے کیونکہ مضامین کی

آمدنشاط وانشراح قلب پر موقوف ہے اور سامعین کی بے توجہی دیکھ کر بیان کرنے والے کی طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔

دورانِ وعظ سونا اونگھنا

بعض دفعہ رات کو بیان کرنے کا اتفاق ہوتا ہے تو بعض لوگ اس وقت اونگھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اونگھنے والے کی صورت دیکھ کر مجھے مضمون کی آمد بند ہو جاتی ہے۔ پس یہ سخت ناانصافی ہے کہ میں تو اپنا دماغ صرف کروں آپ کے لیے اپنا وقت خرچ کروں اور تم اس کی یہ قدر کرو کہ اپنی اپنی باتوں میں لگی رہو، باتوں کے لیے ساری عمر پڑی ہے جب میں چلا جاؤں گا پھر جتنی چاہے باتیں کرلینا

(پھر کچھ عورتوں کی آواز آئی) حضرت نے فرمایا بھائی باتیں کرنے سے طبیعت اُچاٹ ہو جاتی ہے، مضمون گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ اگر تم اپنی باتیں بند نہیں کرتیں تو پھر ہم سے کہہ دو ہم اپنی باتوں کو بند کر دیں۔ ورنہ اس کی احتیاط رکھو اس وقت باتیں کرنا جائز نہیں جیسا کہ ابھی میں نے حکم بتلایا تھا۔ (حقوق الزوجین الکمال فی الدین ص۴۸)

دورانِ وعظ اگر باتیں کرنیکی ضرورت پیش آجائے

جن مستورات کو باتیں کرنا ہوں وہ یہاں (اس مجلس وعظ) سے اٹھ کر دوسرے کمرہ میں چلی جائیں تاکہ گناہ سے بھی محفوظ رہیں۔ اور دوسری سننے والیوں کے سننے میں خلل انداز بھی نہ ہوں۔

اگر کسی کی طبیعت باتوں سے نہیں رکتی تو بلند آواز سے باتیں نہ کرو۔ آہستہ

ہی کر لو۔ (حقوق الزوجین ص۴۵، ص۴۶۔ رمضان فی رمضان ص۳۲)

بعض لوگوں کی ایک اور غلطی

اور بعض لوگ جو بیان کو اپنے حال پر منطبق کرتے ہیں تو وہ ایک دوسری غلطی میں پڑ جاتے ہیں یعنی وہ وعظ میں بعض امراض کا حال سن کر اور ان کے اپنے حال پر منطبق (اور چسپاں) دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ آج تو ہماری خبر لی گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ہماری چغلی کھائی ہے۔ (غیبت کی ہے) پھر بدگمانی کر کے کسی سے عداوت کرنے لگتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط خیال ہے اصل بات یہ ہے کہ وعظ میں عام امراض کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں اکثر لوگ مبتلا ہیں۔ تو وہ لامحالہ مخالفین کے خیال پر منطبق ہوں گے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ کسی نے آپ کی چغلی کھائی ہو۔

دوسرے اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ حق تعالیٰ بیان کرنے والے کے دل میں ڈال دیتے ہیں کہ اس وقت فلاں مرض کا علاج بیان کرنا چاہیئے۔ اس وقت جو مضمون واعظ کے دل میں آئے گا وہ ضرور موقع کے موافق اور سامعین کی حالت پر منطبق ہوگا۔ اس کو بدگمانی چغلی (غیبت) پر محمول کرنا سخت غلطی ہے۔

اور فرض کر لو کسی نے چغلی بھی کھائی ہو (اور غیبت بھی کی ہو) تو آپ کا کیا نقصان ہوا؟ آپ کو تو ایک مرض کا علاج معلوم ہو گیا۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک مریض طبیب (ڈاکٹر) سے اپنا مرض ظاہر کرتے ہوئے شرماتا ہو اور کوئی دوسرا شخص طبیب سے کہہ دے کہ اس کو یہ مرض ہے اور طبیب اس کا علاج بتلا دے تو بتلایئے مریض اس کا شکر گزار ہوگا یا اس سے دشمنی کرے گا؟ یقیناً

شکر گزار ہوگا اسی طرح آپ کو شکر گزار ہونا چاہیئے۔
پس جو لوگ وعظ میں اپنے امراض کا علاج سُن کر دوسروں سے ناخوش ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ وعظ میں علاج کے لئے نہیں آتے
(اصلاح ذات البین آداب انسانیت ص۲۵۴)

باب ۳

وعظ کہنے کا کس کو حق ہے

عُلماء نے فیصلہ کر دیا ہے اور علماء نے فیصلہ کیا ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمادیا ہے کہ وعظ کہنے کا اہل ہر شخص نہیں ہے کیونکہ ہر منصب کا اہل وہی شخص ہوسکتا ہے جو اس منصب کے شرائط کا جامع ہو۔ یہ تھوڑی کہ ایک آدھ کتاب دیکھی اور واعظ ہوگئے۔

وعظ گوئی صرف علماء کا منصب ہے۔

غیر عالم وعظ کبھی نہ کہے۔ اس میں چند مفاسد ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں حدیث کی مخالفت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر ہے کہ ہر کام اس کے اہل کے سپرد کرنا چاہیئے اور آپ فرماتے ہیں اذا وسد الامر الی غیر اهله فانتظر الساعة کہ جب کام نااہلوں کے سپرد کیے جانے لگیں تو قیامت کے منتظر رہو۔ گویا نااہلوں کو کوئی کام سپرد کرنا اتنی سخت بات ہے کہ اس کا ظہور قیامت کی علامات میں سے ہے

اور یہ امر مصرح اور ثابت ہے کہ جو فعل اختیاری قیامت میں سے ہو. وہ معصیت و مذموم ہے اور ظاہر ہے کہ غیر عالم وعظ گوئی کا اہل نہیں یہ منصب صرف علماء کاملین کا ہے اس لیے غیر عالم کو اس کی اجازت ہرگز نہ دی جائے۔

آپ کو تجربہ نہیں اور مجھے تجربہ ہے جس کی بناء پر میں کہتا ہوں کہ نااہل کو وعظ کی اجازت نہ دینی چاہیئے۔ واللہ جہل کی وجہ سے بڑی خرابیاں ہو رہی ہیں۔ (التبلیغ ص۲۲۸، ص۲۳۷ ج ۱۰)

بعض دفعہ مدرسہ کی طرف سے چندہ کے لیئے جو سفیر بھیجا جاتا ہے تو اس کے متعلق میں نے ایک رائے یہ دی ہے کہ سفیر اگر عالم نہ ہو تو اس کو وعظ گوئی سے منع کر دیا جائے۔ محض محدود الفاظ میں چندہ کی ترغیب دینے کا مضائقہ نہیں۔ (التبلیغ ص۲۲۸ ج ۱۰)

ناقص العلم اور سالک کو وعظ کہنا

فرمایا وعظ اس کو زیبا ہے جس کی کم از کم کتابیں تو ختم ہو گئی ہوں امید ہے کہ وہ مسائل صحیح بتائیں گے۔ اور جاہل پر کیا اطمینان ہے۔ اگر کتابیں پوری کیئے بغیر وعظ کہے گا تو تحصیل علم سے محروم رہے گا۔

اور دوسری دقیق شرط واعظ کے لیئے یہ ہے کہ وہ سلوک میں مشغول نہ ہو۔ وعظ کہنا شغل سلوک کو بھی مضر ہوگا کیونکہ واعظ کو عوام سے تعلق کے بغیر چارہ ہی نہیں اور اس کا مضر ہونا ظاہر ہے۔ (کلام الحسن ص۸۱)

غیر عالم کے وعظ کے نقصانات اور عالم غیر عالم کے وعظ کا فرق

(۱) میں کہتا ہوں کہ یہ کام نااہلوں کو نہ دینا چاہیے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ عالم سے غلطی نہیں ہوتی۔ عالم بھی بشر ہے اس سے بھی غلطی ہو سکتی ہے مگر وہ خفیف (ہلکی) اور قلیل غلطی کرے گا۔ شدید (بڑی) اور بکثرت غلطی نہ کرے گا یعنی اس کے بیان میں شاذ و نادر کبھی سو بار میں ایک بار غلطی ہوگی اور جاہل کے وعظ میں بکثرت غلطیاں ہونگی۔

(۲) پھر عالم کو دوسرے وقت اپنی غلطی پر تنبہ ہو سکتا ہے اور دوسرے بیان میں اس کی اصلاح بھی کر سکتا ہے۔ اور جاہل کو تنبہ بھی نہیں ہوتا کہ میں نے کیا غلطی کی ہے اس لیئے یہ اس سے اشد ہے۔ خوب سمجھ لو۔

(۳) دوسری خرابی اس میں یہ ہے کہ بعض دفعہ جاہل کو کسی مسئلہ میں واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے ایسی غلطی پیش آتی ہے کہ اُسے خبر بھی نہیں ہوتی گو بعض لوگ بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ وہ اپنی علمی حیثیت ہی کے موافق احتیاط کر سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں کر سکتے اور جب پورا علم نہیں تو غلطی کا احتمال رہے گا۔

(۴) علاوہ ازیں جب یہ شخص وعظ کہے گا تو لوگ عالم سمجھ کر اس سے ہر قسم کے مسائل بھی پوچھیں گے پھر آج کل ایسے نفس کہاں ہیں جو صاف کہہ دیں کہ ہم جاہل ہیں ہم کو مسائل معلوم نہیں ضرور کچھ گڑھ مرتبہ کر جواب دیں گے اور اکثر غلط ہوگا اور اگر گول مول جواب دیا اور اس طرح غلط جواب سے اپنے کو بچا لیا تو ممکن ہے کہ عوام اس سے کسی غلطی میں پڑ جائیں۔ بعض دفعہ

جاہل ایسے ہوشیار ہوتے ہیں کہ جو مسئلہ ان کو معلوم نہیں ہوتا اس کا ایسا جواب دیتے ہیں کہ جس سے نہ جواب معلوم ہو نہ جہل ظاہر ہو۔
(التبلیغ ص ۲۲۹، ص ۲۳۶ ج ۱۰)

نیم عالم جاہل مولوی کے وعظ کی ایک حکایت

ایک نیم ملّانے گاؤں کے ایک چودھری کو مسئلہ بتلایا تھا کہ بغیر نیت کے روزہ نہیں ہوتا۔ اس نے پوچھا نیت کیا چیز ہے آپ نے کہا نیت یہ ہے اَللّٰھُمَّ بِصَوْمِ غَدٍ نَوَیْتُ۔ دوسرے روز جو دیکھا تو چودھری مزہ سے بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ پوچھا ارے یہ کیا؟ روزہ نہیں رکھا؟ اس نے کہا کیا کروں بغیر نیت کے روزہ ہوتا نہیں اور نیت ابھی یاد نہیں ہوئی اس میں اس کی بھی غلطی ہے کہ پھر مسئلہ پوچھ لیتا کہ اگر کسی کو نیت یاد نہ ہو تو کیا کرے اور مولوی صاحب کی بھی غلطی ہے کہ خواہ مخواہ انہوں نے گنوار کو عربی میں نیت بتلائی۔ اوّل تو زبان سے کہنا ضروری نہیں اور اگر کسی کو کہنا ہی ہے تو اُردو میں بھی کافی ہے (لیکن جاہل واعظ کو اتنا علم کہاں) (التبلیغ ص ۳۴ج ۲۰)

واعظ بننے کا اہل

واعظ خواہ متبحر عالم نہ ہو مگر دینیات پر کافی نظر ہو کہ تقریر میں یا کسی سوال کے جواب میں غلط روایت یا غلط مسئلہ بیان نہ کرے۔ (تجدید تعلیم ص ۱۸۸)
جیسے آج کل بعض لوگ اردو کتابیں دیکھ کر وعظ کہنے لگے اور مسائل میں ایسی غلطیاں کرتے ہیں کہ کچھ انتہا نہیں ترجمہ تک غلط کرتے ہیں۔
تبلیغ خاص کے لئے تو مسئلہ کی حقیقت کا پورے طور سے منکشف ہونا

اور قدرت ہونا شرط ہے اور تبلیغ عام یعنی وعظ کہنا یہ علماء کا کام ہے۔
(دعوت و تبلیغ ص۱۰۶)

شرعی دلیل اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرما دیا ہے لَا یَقُصُّ اِلَّا اَمِیْرٌ اَوْ مَامُوْرٌ اَوْ مُخْتَالٌ۔ یعنی وعظ تین شخص کہتے ہیں ایک حاکم دوسرے جو مامور ہو یعنی جس کو حاکمِ اسلام نے اس کام کے لئے مقرر کیا ہو یا اہل حل و عقد نے جو حاکم کو بھی حاکم بناتے ہیں۔

اہلِ علم کی سمجھنے کی بات ہے کہ اہل حل و عقد اصل ہیں اور حاکم ان کا نائب ہے یعنی جو اہل الرائے ہوں مثلاً علماء و مشائخ کیونکہ یہی دین کے سمجھ دار لوگ ہیں وہ جس کو وعظ کہنے کی اجازت دے دیں یا ان کا نائب جو امیر المومنین ہے وہ کسی کو مامور کر دے تو یا خود حاکم یا جس کو حاکم یا ایسے علماء متفق ہو کر مامور کر دیں وہی وعظ کہہ سکتا ہے۔

تیسرا اگر کہے تو متکبّر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا طالب ہے چاہتا ہے کہ کچھ رقم کچھ روپیہ ہاتھ آجائے۔ اسے وعظ کہنا جائز نہیں۔

مامور اسے کہتے ہیں جسے اس کام کے واسطے امام نے مقرر کیا ہو۔ پھر یہ دیکھنا چاہیئے کہ امیر المومنین کی امارت مستفادہ کہاں سے ہے ظاہر ہے کہ اس کی امارت عامۂ مومنین سے مستفاد ہے جس کو عام مومنین تجویز کر دیں وہ حاکم ہو جائے گا اور شریعت نے بھی اس کو حاکم مانا ہے تو اصل امر حکومت عامہ مومنین ہوئے۔

اب امام جو کسی کو معین کرتا ہے تو وہ وکیل ہونے کی حیثیت سے مامور کرتا ہے تو جس کو امام نے مقرر کیا ہے واقع میں عامہ مومنین اس کو مامور بناتے ہیں لہٰذا مامور اسے بھی کہیں گے جو عامہ مومنین کی طرف سے ہو۔

کیونکہ شریعت کا یہ اصول ہے کہ جہاں کسی شخص کو کوئی خدمت سپرد کرنے کی ضرورت ہو اور امیر المومنین وہاں موجود نہ ہو جو اس کا تقرر کر سکے تو وہاں پر عامۂ مومنین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سب مل کر کسی مسلمان کو جو اس خدمت کا اہل ہو وہ خدمت سپرد کر دیں۔

اب عامۂ مومنین کا اجتماع تو مشکل ہے اس لیے وہ لوگ ان کے قائم مقام ہوں گے جن کو عامۂ مومنین سمجھیں کہ یہ ہمارے بڑے ہیں۔ ان کو زبانِ حال سے مانتے ہوں خواہ ان کا دینی اثر ہو یا دنیادی، اور وہ کون لوگ ہیں ؟

الفتیا ر و اہل حل و عقد۔ (یعنی) عامہ مومنین میں، جو ذی اثر لوگ ہوں گے جیسے علماء، رؤساء، امراء و سلاطین جن کو اہل حل و عقد کہا جاتا ہے وہ ان کے قائم مقام سمجھیں جائیں گے اور ان ذی اثر لوگوں کا اجتماع عامہ مومنین کا اجتماع قرار دیا جائے گا۔ لہٰذا ان ذی اثر لوگوں کا مامور بھی عامہ مومنین کا مامور سمجھا جائے گا۔

ماں (خلاصہ) یہ نکلا کہ جسے یہ لوگ وعظ کی اجازت دیں وہ مامور میں داخل ہے۔ پھر اجازت کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ وعظ کہنے والا ان سے اجازت طلب کرے اور وہ اجازت دے دیں۔

دوسرے یہ کہ جس سے دین دار لوگ استدعاء (درخواست) کریں کہ یہ وعظ سنائے پس اہلیت والے واعظین سے مخالف ہونے کا شبہ جاتا رہا۔ (اگر غور سے دیکھا جائے) تو بعض لحاظ سے اس مامور کا درجہ امیر المومنین کے مامور سے بھی بڑھ کر ہوگا کیونکہ امیر کے بھی امیر کا مامور ہوگا یعنی عامہ مومنین کا پس اگر مسلمانوں میں سے چند ذی اثر ذی فہم (سمجھ دار) لوگ کسی اہل سے وعظ کی فرمائش کریں خواہ قولاً خواہ دلالۃً تو وہ شخص بھی مامورین میں داخل ہو جائے گا لہٰذا اس کو وعظ کہنا جائز ہوگا۔

پس خلاصہ یہ ہے کہ عامہ مومنین میں دو حیثیتیں ہیں ایک تو یہ کہ جب تک وہ کسی کو حکومت کا منصب نہ دیں اس وقت تک وہ آمر ہیں اور جب وہ حکومت پر کسی کا تقرر کردیں تو پھر وہ مامور کے تابع ہو جائیں گے۔
لیکن اگر سب مل کر اس صاحب حکومت کو معزول کرنا چاہیں تو پھر آمر ہو جائیں گے گویا عامہ مومنین انفراداً تو تابع ہیں اور اجتماعاً متبوع ہیں۔

غیر عالم بصیرت والا دیندار اور طالب علم وعظ کہہ سکتا ہے یا نہیں؟ حدود وشرائط۔

تبلیغ عام یعنی وعظ کہنا علماء کا کام ہے خواہ درسیات پڑھ کر عالم ہوا ہو، یا کسی عالم سے مسائل سن کر عالم ہوگیا ہو اس کو بھی تبلیغ عام (وعظ) کی اجازت ہے بشرطیکہ (۱) کسی بڑے نے اس کو اس کام کے لئے معین کیا ہو۔
چنانچہ صحابہؓ نے کہاں پڑھا تھا۔ وہ بھی سن سن کر تبلیغ کرتے تھے مگر ہر شخص خود یہ نہ سمجھ لے کہ میں اس قابل ہوں جب تک کہ کوئی کامل نہ کہہ دے کہ (واقعی) تم اس قابل ہو۔
بعض اَن پڑھ بھی صاحب کمال اور دیندار فہیم (سمجھ دار) ہوتے ہیں۔ ان کا حافظہ بھی اچھا ہوتا ہے اور اس کے باوجود اگر ان سے کوئی بات پوچھی جائے اور ان کو معلوم نہ ہو تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں۔ ایسے لوگوں کا وعظ کہنا کسی عالم کی اجازت کے بعد جائز ہے۔
شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کے زمانے میں ایک اُمّی (ان پڑھ) شخص وعظ کہتا تھا مگر اس کا حافظہ ایسا اچھا تھا کہ وہ شاہ صاحب کے وعظ کو ازبر یاد

کرتا تھا تو ایسے شخص کو اجازت ہے جب کہ ہر پہلو سے یقین ہو جائے کہ قوی الحافظہ ہے، متدین بھی ہے اور اس کے دین کی جانچ بھی کر لی ہو۔
اسی طرح اگر کسی طالب علم کو وعظ کے لئے متعین کیا جائے تو جائز ہے مگر اس کے حدود مقرر کر دو کہ اس حد تک کام کرو آگے نہ بڑھو۔
(جیسے تبلیغ والوں کو صرف چھ نمبر بیان کرنے کی اجازت ہے) آخر دنیا کے ہر کام کی ایک حد ہے کہ اس حد سے تجاوز کرنا جائز نہیں رکھا جاتا۔
(آداب تبلیغ ملحقہ دعوت و تبلیغ ص۱۰۸)

جانچ کا طریقہ۔

جیسے ڈاک خانہ کے افسر اپنے ہاتھ سے ڈاک خانہ میں اپنے نام کے خطوط ڈال ڈال کر ڈاکیہ کی جانچ کے لئے دیکھتے ہیں کہ پہنچتا ہے یا نہیں اسی طرح مختلف جلسوں میں اس شخص سے مسائل پوچھاؤ پھر دیکھو جو باتیں اس کو معلوم نہیں ان کا کیا جواب دیتا ہے۔ اگر کہہ دے کہ معلوم نہیں تو سمجھ لو کہ اس میں تدین ہے (یہ امتحان تو تدین کا ہوا اور فہم کا امتحان تو خود اس کی صلاحیتوں سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ (آداب التبلیغ ص۱۰۹)

بے عمل عالم پر بھی وعظ کرنا واجب ہے

واعظ کے لئے با عمل ہونا شرط نہیں بے عمل پر بھی وعظ کرنا واجب ہے جیسے طبیب (حکیم) کا پرہیز ہونا شرط نہیں۔ بد پرہیز پر بھی مریض کا علاج کرنا واجب ہے۔ (الافاضات الیومیہ ص۳۱۶ ج ۲)
میں جو کچھ بیان کروں گا قرآن و حدیث سے بیان کروں گا جس پر ہر مسلمان

عمل کرنے کا طالب ہے۔ اس لیے آپ مضمون پر نظر رکھیں اس کو نہ دیکھیں کہ بیان کرنے والا کیسا ہے۔ میرے اندر ہزار عیوب سہی لیکن انشاء اللہ آپ کو وہی راستہ بتلاؤں گا جو آپ کے واسطے نافع ہے۔ اور اس کو نافع میرے ہی کہنے سے نہ سمجھو خالی الذہن ہو کر سن لو پھر خود غور کر دیا جس سے عقیدت ہو اس سے تحقیق کر لو۔ اس کے بعد بھی اگر غلطی ہو گی معذور رہو گے

بلا عمل کے وعظ کہنے کی ممانعت نہیں بلکہ جو شخص وعظ کہتا ہو اس کو خصوصًا عمل کرنے کی بھی زیادہ کوشش کرنا چاہیے۔ نہ یہ کہ وعظ بھی ترک کر دے۔ البتہ ایسے شخص کا وعظ جو بد عمل ہو برکت سے ضرور خالی ہوتا ہے لیکن بد عمل ریاکار کی نماز میں بھی نورانیت نہیں رہتی تو کیا اس سے نماز کی فرضیت بھی ساقط ہو جاتی ہے؟ (تجدید تعلیم و دین ص۲۴)

بے عمل واعظ عالم کو بھی وعظ کہنا چاہیئے

یہ نہ سمجھنا کہ اگر عمل نہ ہو تو وعظ ہی نہ کہے جیسا کہ بعض لوگوں کو اس میں بھی غلطی ہو جاتی ہے بلا عمل کے وعظ کہنے کی ممانعت نہیں ہے بلکہ اس شخص کو عمل کی کوشش کرنی چاہیئے اور وعظ ترک نہ کرنا چاہیئے۔
(لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ) واعظ نے تو عمل کا اہتمام نہیں اور اگر عمل کے لیے کہا گیا تو وعظ ہی چھوڑ دیا کہ عمل تو ہوتا نہیں وعظ کیا کہیں۔
اور اگر وعظ سننے والے بھی یہی کہیں کہ جب عمل نہیں ہوتا تو سن کر کیا کریں تو پھر کیا ہو دین کا یہ باب ہی مسدود ہو جائے۔

غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگ تو یہاں تک غلطی میں ہیں کہ اپنے وعظ کہنے کو شرعاً

منہی عنہ (ممنوع) سمجھتے ہیں۔ یہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ ان کا مستدل یہ ارشاد ہے۔ لم تقولون ما لا تفعلون کبر مقتا عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون۔

ایک دوسری آیت میں ہے جو اس سے بھی صاف ہے اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم۔ پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اے ایمان والو وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ خدا کے نزدیک نہایت مبغوض وناپسند ہے کہ وہ کہو جو کرو نہیں۔

اور دوسری آیت میں تو ظاہراً بدعمل نصیحت کرنے ہی پر تصریحاً انکار ہے اس لیے اگر اس سے شبہ پڑ جائے تو بعید نہیں۔

پہلے اس آیت کو سمجھ لیجئے جس میں ظاہراً اس کا صریح ذکر ہے۔ مگر اس کے بھی یہ معنی نہیں کہ ناسی نفس یعنی بدعمل کو وعظ کہنے کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ واعظ کو نسیان نفس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وعظ تو کہو مگر بدعمل مت بنو بلکہ جو نصیحت دوسروں کو کرتے ہو وہ اپنے نفس کو بھی کرو اور اس کو بھی عمل کراؤ۔

اب رہا یہ شبہ کہ ہمزہ استفہام انکاری تو تامرون پر داخل ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسی نفس (یعنی بدعمل کو) امر بالبر یعنی وعظ کی ممانعت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اہل علم جانتے ہیں کہ ہمزہ کا مدخول دونوں جملوں کا مجموعہ ہے تو مراد یہ ہے کہ امر بالمعروف اور بدعملی کو جمع نہ کرو تو باحتمال عقلی اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ امر بالمعروف تو کرو مگر بدعملی نہ کرو۔ ایک یہ کہ اگر بدعملی کا وقوع ہو تو پھر امر بالمعروف نہ کرو۔ تو لوگوں نے اس کا مطلب اسی دوسری صورت کو سمجھا کہ عمل بد میں مبتلا ہو تو وعظ کو چھوڑ دو مگر یہ اس لیے غلط ہے کہ قواعد شرعیہ کے خلاف ہے۔ دوسرے دلائل

سے اس کا احتمال نہیں رہتا اور اگر فرضاً احتمال ہو تو تمہارا استدلال اس سے جاتا رہا۔ اب رہی پہلی آیت لم تقولون مالا تفعلون۔ تو یہاں تقولون کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اصل میں قول کے دو معنی ہیں یا یہ کہو کہ قول کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قول انشائی، ایک قول خبری۔ قول خبری یہ کہ تم بذریعہ قول کسی بات کی خبر دیتے ہو ماضی کی یا مستقبل کی اور قول انشائی یہ کہ خبر نہیں بلکہ کسی بات کا امر و نہی کرتے ہو تو یہاں پہ قول انشائی مراد نہیں قول خبری یعنی ایک دعویٰ مراد ہے چنانچہ اس کا شان نزول یہ ہے کہ لوگوں نے کہا تھا کہ ہم کو اگر کوئی ایسا عمل معلوم ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک افضل و محبوب ہو تو ہم ایسی ایسی کوشش کریں۔ پھر قتال کا حکم نازل ہونے پر بعض لوگ جان بچانے لگے۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں پس اس دعویٰ کے متعلق ارشاد ہے کہ ایسی بات کہتے ہی کیوں ہو جو کرتے نہیں۔ سو اس آیت میں دعوے کا قول مراد ہے۔ نصیحت کا قول مراد نہیں۔

چنانچہ انہی آیتوں میں اس کا قرینہ بھی ہے اِنَّ اللہَ یحبُّ الذین یقاتلون فی سبیلہ۔ (التبلیغ ص۴۴)

عوام کیسے مقرر اور واعظ کا وعظ سنیں۔ واعظ کے انتخاب کا معیار۔

(۱) علماء میں بھی انتخاب اسی معیار سے ہوگا کہ جس کے ہاتھ سے اکثر لوگوں کو ہدایت ہوتی ہو۔ طالبین پر شفقت کرتا ہو۔ خود دنیا سے نفور (متنفر) ہو (یعنی حب دنیا کا شکار نہ ہو) گناہوں سے بچتا ہو۔ کسی بزرگ کی صحبت میں رہا ہو۔ اس پر خشیت الٰہی غالب ہو۔ پس اس کے کہنے پر عمل کرو کیونکہ

وہ تم کو جو کچھ بھی بتلائے گا اس میں خدا کا خوف کرے گا۔ اور گڑبڑ نہ کرے گا۔ کچھ کا کچھ نہ بتلائے گا لیکن دوسروں کو بھی بُرا نہ کہو۔

(دعوات عبدیت ص۱۵۱ ج ۵)

(۲) جب کوئی جدید (نیا) واعظ آئے تو اپنے شہر یا قریب کے کسی معتبر عالم سے اس واعظ کی حالت پوچھ لو۔ اگر وہ اطمینان دلا دے تو وعظ سنو ورنہ نہ سنو کیونکہ بعض واعظ جاہل ہوتے ہیں اور بعض بد مذہب اور ان میں بعض اپنے (غلط) دعویٰ کو ذہن میں جما دینے کا ملکہ رکھتے ہیں اور بعض ایسے چالاک ہوتے ہیں کہ شروع شروع میں مخاطبین کے موافق (باتیں) کہتے ہیں پھر مناسبت (موانست) ہو جانے کے بعد اپنے مسلک کی دعوت شروع کر دیتے ہیں۔ (اصلاح انقلاب ص۳۲)

(۳) ہر شخص کا وعظ نہ سنیں، اور یہ قید لگا دیں کہ کسی معتبر عالم سے اپنے عالم (اور وعظ کا اہل) ہونے کی تصدیق کرا دو جب ہم وعظ سنیں گے۔ سندوں کا اعتبار ہرگز نہ کیا جائے۔ جعلی سند تو ہر ایک بنا سکتا ہے جب وہ تصدیق نہ کرا سکا تو اس کا وعظ نہ سنے اور ایسوں کے ساتھ صرف یہ سلوک کر دیں کہ ان کو کھانا کھلا دیا اور وعظ سے منع کر دیا۔ میں خدمت سے منع نہیں کرتا۔ حسب موقع محل خدمت کر دو ممکن ہے کہ محتاج ہو مگر وعظ مستند اور مصدق (تصدیق شدہ) شخص کے سوا کسی کا نہ سنیں۔

(التبلیغ ص۱۵۷ ج ۱)

عوام کی ذمہ داری۔

جہاں مدرسہ و انجمن نہ ہو یا کسی وجہ سے اس (مقرر اور واعظ) کا انتظام نہ کر سکے وہاں رؤساء انفراداً (تنہا) یا اشتراکاً (مل کر کے) اپنے پاس سے

تنخواہ دے کر ایسا واعظ مقرر کر دیں مگر اس کا انتخاب علماء سے کرائیں جہاں ایسا کوئی باہمت رئیس نہ ہو وہاں اہل بستی باہمی چندہ سے (یہ کام) کریں۔ مگر چندہ میں کسی پر جبر نہ کریں۔ (تجدید تعلیم و تبلیغ ۱۵۹)

آج کل کے نام نہاد مشہور واعظین و مقررین

آجکل جس طرح ہر کام کی مشینیں ایجاد ہو گئی ہیں اور ان سے ہر کام سہل اور ارزاں (سستا) ہو گیا ہے اسی طرح مولویت کی بھی مشینیں بن گئی ہیں۔ جابجا ناول و اخبار بینی کے لئے کتب خانے قائم ہیں۔ قوم کا روپیہ وقت برباد ہو رہا ہے جس کا جی چاہا آیا اور اخبار اور دو چار ناول دیکھے اس کے کچھ الفاظ اور تقریریں یاد کرلیں اور مولانا صاحب (اور واعظ صاحب) بن گئے۔ واعظین بھی کیسے کہ علم سے بالکل بے بہرہ، دو چار مضمون اردو کے رسالوں سے یاد کر لیے اور بس مولانا بن گئے۔ یہ مولانا بمعنی سیدنا نہیں بلکہ غلامنا ہے۔ کیونکہ مولیٰ کے معنی سید کے بھی ہیں اور غلام کے بھی ہیں سید تو جب ہوتے کہ جب اہل علم ہوتے اور اب تو نرے غلام ہیں کہ جس کی مرضی دیکھی ویسا ہی اُسے سنا دیا۔ حضرت محض وعظ کہنے سے آدمی اہل علم نہیں ہو جاتا۔

اور ایسے ہی مولوی اکثر مجالس اسلامیہ کی رونق کے لئے جمع کیئے جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی جہالت اور لالچ کی وجہ سے آپ کی بدعات کی تائید کر جاتے ہیں اب اگر کوئی محقق منع کرتا ہے تو اس کی سادگی کی وجہ سے اس کا کہنا نہیں سنتے۔

غرض تصنع کا بڑا زور ہے جس میں کئی کئی واعظین کا جمع کرنا بھی ہے۔ اتنے تکلفات کی کیا ضرورت ہے کہ بہت سے واعظوں کو جمع

کیا جائے اور اس میں اہل اور نا اہل کا امتیاز بھی نہ رکھا جائے خصوصاً جب کہ معراج یا میلاد کے جلسے کیے جائیں اور اس میں علماء سے فرمائش کی جائے کہ وہ عوام کے تجویز کردہ مضامین کی پابندی کریں۔ اللہ اکبر! علماء کو مشورہ دیں عوام الناس ؟ معراج اور میلاد کا بیان تو بہت کتابوں میں موجود ہے۔ آپ خود ہی کتابوں میں لے کر کھڑے ہو کر پڑھ دیجئے۔ بلکہ یہ تو اور بہت اچھا ہوگا کیونکہ زبانی اتنی روایتیں کسی کو یاد نہیں۔

بہر حال علماء سے فرمائش کرنا بہت بے ادبی کی بات ہے۔ انہیں تو آزاد چھوڑ دو۔ اور یہ کہہ دو کہ جو مرض ہو اس کے متعلق بیان کیجئے۔ مگر ایسا اس لیے نہیں کرتے کہ ایک تو مجلس کے رنگ کے خلاف ہوتا ہے دوسرے یہ غرض ہوتی ہے کہ ہمارے امراض بیان نہ کریں کیونکہ ایسے جلسوں میں مختلف مذاق کے لوگ جمع ہوتے ہیں ممکن ہے کسی کے خلاف گزرنے اور ناگوار ہو۔ مثلاً اگر میں یہ کہوں کہ سود لینا حرام ہے رشوت لینا حرام ہے۔ ترک نماز پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کا فر تک فرمایا ہے تو کہیں سود خور ناراض ہو جائیں گے اور کہیں رشوت خور ناراض ہو جائیں گے اور کہیں بے نمازی بگڑ جائیں گے اور اس سے مجلس میں سناٹا ہو جائے گا۔

اور اکثر ایسے عام جلسوں میں علماء تو ہوتے نہیں اکثر فیس والے جمع ہوتے ہیں ان سے جو فرمائش کر دے وہ چار و ناچار (بہرصورت) اسے پورا کرتے ہیں۔ حالت ان لوگوں کی یہ ہے کہ سیکنڈ کلاس میں تو سفر کر کے آتے ہیں۔ تاروں میں بات چیت کرتے ہیں خس کی ٹٹیوں میں قیام کرتے ہیں۔ خطاب تو بڑے بڑے لمبے چوڑے مل جاتے ہیں۔ کوئی شمس العلماء ہے کوئی بدر العلماء ہے۔ میں کہتا ہوں کہ

شمس العلماء، تو ہیں مگر شمسِ مخسوف۔ یعنی آفتاب تو ہیں مگر گہن لگے ہوئے آفتاب ہیں جن میں نور بالکل نہیں۔
(اصلاح الیتامیٰ ملحقہ حقوق و فرائض ص۳۷)

عوام کی دوسری ذمّہ داری

اگر کوئی اسلامی مجلس کیجئے تو علماء کو بلائیے فیس لینے والوں کو نہ بلایئے۔ مگر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کیسے پہچانیں؟ اس کی سہل ترکیب یہ ہے کہ مقامی علماء سے انتخاب کرائیے۔ "ولی را ولی می شناسد"۔ (ولی کو ولی پہچانتا ہے) اسی طرح عالم کو عالم ہی خوب پہچانتا ہے۔ اب اگر علماء ہی انتخاب میں گڑبڑ کریں تو وہ ذمہ دار ہوں گے۔ اگر وہ بددیانتی کریں گے تو خدا کے یہاں ان کی گردن نپی جائے گی مگر افسوس ایسا نہیں کیا جاتا خود عوام کو جو سمجھ میں آتا ہے وہی کرتے ہیں۔ (اصلاح الیتامیٰ ملحقہ حقوق و فرائض ص۳۷)

نااہل کا وعظ کہنا اور اس کا سننا جائز نہیں۔

اور علم کی شرط ہونے سے معلوم ہوگیا کہ آج کل جو اکثر جاہل یا کالجاہل وعظ کہتے پھرتے ہیں اور بے دھڑک روایات و احکام بلاتحقیق بیان کرتے ہیں سخت گنہگار ہوتے اور سامعین کو بھی ان کا وعظ سننا جائز نہیں۔ (بیان القرآن ص۴۷، ص۲۷ پ۴۔ آل عمران)

بعض لوگ جن کی تربیت نہیں ہوتی اور مقتداء بن جاتے ہیں ان کے اخلاق نہایت خراب ہوتے ہیں اور وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ چھوٹا

ہونے سے قبل بڑے ہو جاتے ہیں۔

سفیر (محصل چندہ) اگر عالم نہ ہو تو اس کو وعظ گوئی سے منع کر دیا جائے محدود الفاظ سے محض ترغیب چندہ کا مضائقہ نہیں مگر غیر عالم وعظ کبھی نہ کہے اس میں چند مفاسد ہیں ایک تو یہ کہ اس میں اس حدیث کی مخالفت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ ہر کام اس کے اہل کے سپرد کرنا چاہیئے۔ اور آپ فرماتے ہیں۔ اذا وسد الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ۔ کہ جب نااہلوں کے سپرد کام کیا جانے لگے تو قیامت کے منتظر رہو۔ گویا نااہل کو کوئی کام سپرد کرنا اتنی سخت بات ہے کہ اس کا ظہور قیامت کی علامات سے ہے۔ اور یہ امر مصرح ہے کہ جو فعل اختیاری علامات قیامت سے ہو وہ معصیت اور مذموم ہے۔ اور ظاہر ہے کہ غیر عالم وعظ گوئی کا اہل نہیں۔ یہ منصب صرف علماء کاملین کا ہے۔ اس لیے غیر عالم کو اس کی اجازت ہرگز نہ دی جائے (التبلیغ وعظ الہدی والمغفرۃ ص۵۳)

بعض عوام کی غلطی۔

بعض عوام کا خیال ہوتا ہے کہ وعظ سن کر عمل کرنا پڑے گا اس لیے وعظ ہی نہ سننا چاہیئے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اس وقت آپ کے اوپر دو جرم قائم ہوں گے۔ ایک ترک علم کا (یعنی دین کی بات نہ سننے کا) اور ایک ترک عمل (یعنی عمل نہ کرنے) کا اور وعظ سن کر عمل نہ کیا تو صرف ترک عمل کا گناہ ہوگا۔ ترک علم کا گناہ تو نہ ہوگا۔ جو علم عمل سے خالی ہو وہ حجۃ اللہ علی العبد (یعنی بندے کے خلاف حجت ہوگا) لیکن محض جہالت سے پھر بھی اچھا ہے کیوں کہ اس پر ایک ہی جرم قائم ہوگا یعنی ترک عمل کا اور اگر علم بھی حاصل نہ کیا تو دوسرا جرم ترک علم کا بھی

قائم ہوگا۔ (التبلیغ الربانی ص۶۲ ملحقہ حقوق و فرائض)

باب ۱۴

وعظ تقریر سے پہلے دُعاء کی ضرورت، نیک فال اور مجلس کے مقبول ہونے کی علامت

میں نے اپنے بیان کے لئے پہلے سے یہی آیت تجویز کی تھی۔ مگر حسنِ اتفاق کہ قاری صاحب نے بھی یہی رکوع سنایا۔ قاری صاحب کے شروع کرتے ہی مجھے یہ خیال ہوا کہ تجویزوں کا یہ توافق (اور مطابقت) انشاء اللہ اس مجلس کے مقبول ہونے کی علامت ہے۔

حدیث شریف میں شب قدر کی بابت ارشاد ہے کہ چونکہ چند خواب متفق ہیں کہ اس عشرہ میں شب قدر ہے اس لیے غالب گمان اسی کے موافق ہے۔ اس سے عارفین نے یہ بھی استنباط کیا ہے کہ چند قلوب کے واردات کا مجتمع ہو جانا اس وارد کے صحیح (اور مقبول) ہونے کی دلیل ظنی ہوتی ہے۔ اگرچہ ہم کیا اور ہمارے واردات کیا لیکن چھوٹی باتوں میں چھوٹے واردات کا بھی ہم وہی اثر کہیں گے جو کہ بڑی باتوں میں بڑے واردات کا اثر ہوتا ہے اس وقت میرے اور قاری صاحب کے دل میں یہ آنا کہ اسی آیت کی تلاوت کی جائے اور ظاہر ہے کہ ہم دونوں میں کم از کم بحمداللہ اسلام تو ضرور ہے اور ہماری مجلس چھوٹی ہی سی مجلس ہے مگر یہ قرینہ اس کا ہے کہ

انشاء اللہ تعالیٰ یہ مجلس بے فائدہ نہیں ہے بلکہ امید ہے کہ مقبول ہو گی۔ لیکن اس قرینہ پر اکتفا و اعتماد نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس کی مقبولیت کے لئے تدبیر بھی کی جائے اور وہ تدبیر اتباع سنت ہے اور اس کے ساتھ دعاء بھی کرنی چاہیئے۔ ہر امر میں بڑی چیز دعا اور اتباع سنت ہے۔ باقی سب مل کو خوش کرنے والے قرائن درجہ خال میں ہیں جو کہ مبشر ہوتی ہیں۔ اور سب سے ادنیٰ درجہ بشارت کا ہوتا ہے اس کے بعد تدبیر کا مرتبہ ہے اور سب سے اعلیٰ مرتبہ دعاء کا ہے جو تدبیر کے ساتھ ساتھ ہو۔ گویا ہر امر میں کامیابی کے لئے علت تامہ کا جزاخیر دعاء ہے۔ دعاء کو بھی جلب منفعت (کامیابی) میں بہت بڑا دخل ہے۔ (دعوات عبدیت ص۱۱۲ ج ۱۲)

تقریر میں کون سا موضوع اختیار کرنا چاہیئے۔

اس میں ضرورت وقت کا لحاظ رکھیں جن امور میں لوگ اس زمانہ میں مبتلا ہوں یا جن ضروریات میں فرد گذاشت (کوتاہیاں) کرتے ہوں اس پر بیان کا مدار رکھے (دوسرے مضامین اگر ہوں تو بالتبع اور بعلت (ضمناً و تبعاً اور تھوڑے) ہوں۔

• اور یہ ضروری مضامین (شریعت کے) ابواب کے ہوں۔ صرف عبادات اور دیانات پر اقتصار نہ کریں۔ بلکہ معاملات و معاشرات و اخلاق سے بھی خوب بحث کریں (یعنی ان کا بکثرت بیان کرے کیونکہ) یہ امور ثلثہ متروک ہونے کی وجہ سے زیادہ اہم ہو گئے۔ (اصلاح انقلاب ص۲۳)

ایک دفعہ میں نے وعظ کہنے کا ارادہ کیا۔ خطبہ پڑھا مگر کوئی مضمون ذہن میں نہ آیا۔ لوگوں کی طرف جو دیکھا تو ایک داڑھی منڈا نظر آیا بس مضمون ذہن میں آگیا۔ میں نے کہا ماشاء اللہ آپ لوگوں کی شکل دیکھ کر مضامین یاد آتے ہیں

پھر وعظ میں اسی کے متعلق زیادہ بیان کیا۔ (کلمۃ الحق ۵۳)

وعظ کا مضمون حالات اور ضرورت کے لحاظ سے ہو۔ فرمائش کی وجہ سے نہ ہو۔

میں ایک مقام پر مدعو کیا گیا تھا وہاں پر مجھ سے وعظ سے قبل فرمائش کی گئی کہ ہندوؤں کے بائیکاٹ کے متعلق کچھ بیان کیا جائے بیان سے متعلق میرا ہمیشہ یہ اصول رہا ہے کہ فرمائش پر بیان نہیں کرتا بلکہ ضرورت کو محسوس کر کے وقت پر جو اللہ نے دل میں ڈالا بیان کر دیا۔ اور وہی اکثر مفید ثابت ہوا۔ چنانچہ میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں یہ بیان نہیں کروں گا۔ گو تمہارے نزدیک یہ بیان مفید اور محمود ہو مگر میں اس طرز کو مضر سمجھتا ہوں۔ ایسے طریقے سے بیان کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تو اعلان کر کے سو جاتے ہیں اور دوسرے لوگ جاگ جاتے ہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت جدید ص۱۱ ج ۲)

دیوبند کے جلسہ میں مجھ سے فرمائش کی گئی کہ وعظ میں فضائل رسول بیان کئے جائیں تاکہ عوام کی بدگمانی دور ہو کیونکہ مخالفین نے یہ بہکا رکھا ہے کہ یہ لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہیں میں نے کہا یہ تو متکلم کے مطلب کا وعظ ہوا۔

وعظ تو ایسا ہونا چاہیئے کہ جس سے سننے والوں کو نفع ہو۔ یہاں فضائل رسول کا کون منکر ہے جو ان کا بیان کیا جائے چنانچہ میں نے یہ خیال کر کے کہ آج کل حب دنیا کا مرض عام ہے اسی کے متعلق وعظ کہا جس سے سننے والوں کو نفع ہوا۔ اگر فضائل رسول بیان کرتا تو یہ ہوتا کہ ہم لوگوں کے متعلق بدگمانی شاید جاتی رہتی لیکن یہ کوئی ایسا بڑا مرض میرے نزدیک نہیں تھا یہ

کوئی کفر نہیں، شرک نہیں۔ نبی پر تو ایمان لانا فرض ہے کسی عالم یا درویش پر ایمان لانا تو فرض نہیں۔ خدا تعالیٰ جہاں اور گناہ معاف کرے گا اس بدگمانی کو بھی معاف کر دے گا۔ اور یہ اس وقت ہے جبکہ اس بدگمانی میں ان لوگوں کی نیت بھی خراب ہو ورنہ اگر نیت اچھی ہو اور اجتہادی خطا ہو تو گناہ بھی نہیں بلکہ الٹا ثواب ہوگا۔ (حسن العزیز ص ۵۷۶ ج ۱)

جودھپور کا واقعہ۔

ایک بار میں جودھپور گیا اور مجھ سے اہل شہر نے وعظ کی درخواست کی تو ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ وعظ میں امام ابو حنیفہؒ کے فضائل زیادہ بیان کیجئے گا کیوں کہ یہاں کے لوگ آپ کو اور آپ کی جماعت کو ضعیف فی الحنفیۃ سمجھتے ہیں (یعنی غیر مقلدی کی طرف مائل سمجھتے ہیں) میں نے کہا اب تو میں ہرگز یہ مضمون نہیں بیان کروں گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں لوگوں کو معتقد بنانے کے لئے وعظ کہوں کہ بھائیو ہمیں حنفیت میں ضعیف نہ سمجھو کیونکہ دیکھو ہم امام صاحب کے ایسے معتقد ہیں۔ یہ تو محض اپنی مصلحت ہوئی البتہ اگر سامعین میں کوئی امام صاحب سے غیر معتقد ہوتا تو اس صورت میں امام صاحب کے فضائل بیان کرنے میں بیشک مخاطبین کی مصلحت تھی کہ ایک امام سے بدگمانی دور ہو جاتی۔ مگر جب سامعین میں امام صاحب سے غیر معتقد کوئی نہیں تو اب مضمون ان کی مصلحت سے نہ ہوا بلکہ اس میں محض اپنی مصلحت رہ گئی اور مجھ کو اس سے غیرت آتی ہے کہ لوگوں کو اپنا معتقد بنانے کے لئے کوئی مضمون بیان کروں چنانچہ میں نے یہ مضمون بیان نہیں کیا بلکہ میرے نزدیک سامعین کی اصلاح کے لیے جس مضمون کی ضرورت تھی وہ بیان کیا اور شروع میں کہہ بھی دیا۔ میں اس کو گوارہ نہیں

کرتا کر اپنی نصرت و مصلحت کے لیے مریضوں کی مصلحت فوت کر دوں ۔ وہ طبیب طبیب نہیں جو نسخہ لکھتے ہوئے اپنے مصالح کی رعایت رکھے اور مریض کی مصلحتیں نظر انداز کر دے ۔ (مثلاً ایسی دوائیں لکھے جو اس کے پاس ملتی ہوں) ۔ (التبلیغ صـ۱ ج ۱۴)

مضمون کے انتخاب کا معیار

جی یوں چاہا کرتا ہے کہ ہر موقع پر خواہ موقع زمانی ہو یا مکانی مضمون ضرورت کے موافق بیان ہو اور یوں تو شریعت کے سارے مضامین ہی ضروری ہیں مگر ان میں سے بھی جن کی شدید ضرورت ہو اس کا بیان کیا جائے. اور یہ شدت ہماری غفلت اور بے التفاتی سے بڑھ جاتی ہے. ایک یہ ضروری حکم ہو اور اس سے غفلت و بے التفاتی برتی جا رہی ہو۔

میں اس کو خیانت سمجھتا ہوں کہ واعظ اپنے مصالح کا لحاظ کر کے وعظ کہے. اس کو تو مخاطبین کی مصلحت کا لحاظ کرنا چاہیئے. کہ ان کی اصلاح کس طرز میں زیادہ ہے. چاہے اپنی مصلحت رہے یا جائے. مجھ کو تو اس سے غیرت آتی ہے کہ اپنے مصالح کا لحاظ کر کے بیان کروں ۔

تجربہ یہ ہے کہ جب مخاطب کی مصلحت کا لحاظ کر کے بیان کیا جائے گا تو اس کا اثر ضرور ہو گا. اس لیے میں ہمیشہ مخاطبین کی مصلحت و ضرورت کا لحاظ رکھتا ہوں اور خلاف ضرورت بیان نہیں کرتا ۔

(التبلیغ خیر الارشاد صـ۱، صـ۱۹ ج ۱۴)

کون سے مضامین قابل بیان ہوتے ہیں

وہ مضمون قابل بیان ہوتا ہے جس کی ضرورت ہو اور یوں تو ہر وقت ہر حکم کی ہم کو ضرورت ہے لیکن زمانہ اور لوگوں کے حالات کے اختلاف سے بعض احکام دوسرے بعض کے اعتبار سے زیادہ مہتم بالشان ہو جاتے ہیں جیسے اگر طبیب مریض کو آم کے موسم کے علاوہ میں کہے کہ دیکھو ترش (کھٹا) آم نہ کھانا تو اس حکم کی ممانعت طبی اعتبار سے فی نفسہ ضروری ہے لیکن اس وقت اس کا ممانعت کرنا بالکل زائد امر ہے۔ اس وقت تو اس چیز سے منع کرنا چاہیئے۔ جو موجود اور مضر ہو۔

اسی طرح ناصح (خیر خواہ مقرر) کا حق یہ ہے کہ جس وقت جو مرض پاوے اس کی اصلاح کے متعلق بیان کرے اور چند امراض ہوں تو ان میں اہم کو مقدم کرے اور استیعاب کے ساتھ احکام بیان کرنا اس وقت ہوگا جب کہ کوئی طالب علم مخاطب ہو مثلاً ہدایہ میں پڑھتے پڑھتے کتاب الحج ماہ ربیع الثانی میں آئے تو یہ نہ کہا جائے گا کہ اس وقت اس کی کیا ضرورت ہے اس کی ضرورت تو ماہ ذوالحجہ میں ہے اور وہ بھی جب کوئی حج پر جانے لگے کیونکہ اس کو تو صاحب فن بننا مقصود ہے بخلاف وعظ کے کہ اس میں وقتی ضرورت پر نظر ہوتی ہے اس لیے کہ مخاطبین کو جامع الفن اور محقق بننا مقصود نہیں بلکہ محض اصلاح مقصود ہے مجھ کو ہمیشہ اسی قاعدے کی وجہ سے ان مضامین کا بیان کرنا مناسب معلوم ہوا کرتا ہے جو اس وقت ضروری ہوں۔ (ذم ہوئی ملحقہ آداب انسانیت ص۱۶۱)

فرمائشی بیان مؤثر نہیں ہوتا۔

فرمائشی بیان مؤثر نہیں ہوتا اس لیے کہ اپنے دل سے نہ ہونے کی وجہ سے اس میں خلوص کی قوت نہیں ہوتی اور جو بیان بغیر فرمائش کے ہوتا ہے وہ من جانب اللہ ذہن میں آتا ہے۔ بے فرمائش تو غیب کی زبان ہوتی ہے اور فرمائش کے وقت عیب کی زبان ہوتی ہے اس وجہ سے میں فرمائش کو یا اس کی تعمیل کو پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ فرمائشی بیان اکثر غرض پر مبنی ہوتا ہے خواہ وہ غرض بھی ظاہراً نیک نیتی ہی سے ہو۔ مگر پھر بھی فرمائش پر بیان کرنا دوسرے کی رائے کا اتباع ہے۔ خود اس فرمائشی بیان میں قوت نہیں ہوتی۔ نیز سننے والوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ اپنی تحقیق سے نہیں کہتے بلکہ کہلوایا ہوا کہتے ہیں۔ اس لیے اس کے کہنے کا وہی اثر ہوگا جو سیکرٹری یا صاحب فرمائش کے کہنے کا ہوتا ہے۔ جب دونوں کے کہنے کا اثر یکساں ہوا تو پھر اس کے بیان کی کیا ضرورت ٹھہری۔

یہ میں اس لیے بیان کئے دیتا ہوں کہ اہل علم کو بھی اور عوام کو بھی سبق ہو اور وہ فرمائشی بیان سے احتراز کریں کیونکہ اس میں نہ اہل علم کے بیان کی وقعت ہوتی ہے اور نہ عوام کو نفع ہوتا ہے۔

(اصلاح الیتامیٰ ص۳۵۶ ملحقہ حقوق و فرائض)

محض درخواست کی بناء پر نہیں بلکہ ضرورت کی وجہ سے وعظ کہنا چاہیئے۔

اس وقت کا بیان محض مضمون کی ضرورت کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے

بلکہ بعض طالبین کی استدعاء (فرمائش) کی وجہ سے ہو رہا ہے مگر بات یہ ہے کہ محض استدعاء (درخواست) بیان کرنے کے لئے کافی محرک نہیں بلکہ استدعاء کے بعد جب کوئی ضروری مضمون بھی ذہن میں آجاتا ہے اس وقت بیان ہوتا ہے پس مضمون کی ضرورت کو بھی بیان میں دخل ضرور ہے۔ (المعرق والرحیق ص۱۶۹ ملحقہ جزاء دوسرا جزاء دوسرا لفظ المعرق والرحیق)

ایک شبہ کا جواب اور فرمائش و اطلاع کا فرق۔

اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ غیب کی خبر تو خدا کو ہے بغیر اطلاع کے حالات کا علم ہی کیوں کر ہو سکتا ہے اور وعظ میں وہاں حالات کا علم ضروری ہے میں کہتا ہوں کہ اوّل تو خدا کو خبر ہونی چاہیئے سو ان کو خبر ہے۔ سو جس کی ضرورت ہے وہ خود ہی دل میں ڈال دیں گے۔ مضامین کے پیدا کرنے والا خدا ہے۔ ہم تو مشین ہیں جس کی کل انہی کے ہاتھ میں ہے۔ ہم تو انہی کے قبضہ میں ہیں۔ وہ جدھر چاہیں لے جائیں غرض فاعل تو وہ ہیں ہمیں خبر نہیں تو نہ سہی انہیں تو خبر ہے اگر انجن کو خبر نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں گارڈ اور ڈرائیور کو تو خبر ہے۔ بہرحال خدا کے قبضہ میں ہے۔ وہ خود بخود قلب میں ڈال دیتے ہیں اگر نیت میں ذرا خلوص ہو تو ادھر سے عنایت ہوتی ہے۔ (اصلاح الیتامیٰ ص۲۵۵)

حالات کے اطلاع کی ضرورت۔

دوسرے اطلاع اور چیز ہے اور فرمائش اور چیز۔ اطلاع کر دینے کا تو مضائقہ نہیں کہ یہاں کے یہ حالات ہیں۔ آپ کے مصلح کی

رائے ہے جس طرح مریض طبیب کو حالات سے مطلع کر دیتا ہے۔ مگر فرمائش نہیں کرتا۔ بہرحال ضرورت کی اطلاع کا تو مضائقہ نہیں، مگر فرمائش نہ کرو جس طرح مریض طبیب سے اپنی حالت کی اطلاع کرکے پھر اپنے کو سپرد کر دیتا ہے۔ اسی طرح تم بھی کرو۔

حالات کی اطلاع اکثر جگہ تو مناسب اور بعض اوقات واجب ہے مگر اس بات میں کہیں افراط ہے کہیں تفریط ہے مثلاً پیر و مرید میں تعلق میں اس باب میں تفریط ہے کہ مرید صاحب ضروری حالات سے بھی مطلع نہیں کرتے اور کہیں افراط ہوتا ہے کہ اطلاع کے بعد فرمائش بھی کر دیتے ہیں۔ (اصلاح الیتامیٰ)

ضروری تنبیہ

اور ایک انسان کی کسی حالت پر دوسرے انسان کو قیاس کرنا بھی غلط ہوگا۔ ایک انسان کا دوسرے انسان پر قیاس کرنا تو کیا صحیح ہوتا خود ایک انسان کی ایک حالت کا دوسری حالت پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہوتا مثلاً ایک شخص نے ایک مرتبہ چوری کی تو یہ کیا ضروری ہے کہ جب کہیں چوری ہوئی ہو تو اسی نے کی ہو۔ اسی واسطے ارشاد ہے اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔ (کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں) یہ اخباریات کے متعلق ہے اور انشائیات کے متعلق قیاس کرنے کا امر ہے۔

جب یہ سمجھ میں آگیا تو کسی شخص کو ایسے موقع پر فرمائش کرتا ہوا دیکھ کر دوسرے شخص کی نسبت یہ گمان کرنا کہ اس نے بھی فرمائش کی ہے محض فاسد ہے۔ (اصلاح الیتامیٰ ص۲۵۲)

نئے مضامین اور جدت پسندی کی مذمت

جس قدر مضامین حقہ (درست) ہیں ان میں نیا اور انوکھا مضمون کوئی نہیں بلکہ سب پرانے ہی مضامین ہیں جو تیرہ سو برس پہلے تئیس سال کے اندر اندر نازل ہو چکے ہیں۔

غرض تیرہ سو برس پہلے سب احکام نازل ہو چکے تو اب کوئی مضمون فی نفسہ نیا نہیں۔ البتہ غفلت اور عدم استحضار (ذہن میں حاضر نہ ہونے) کی وجہ سے نئے اور انوکھے معلوم ہوتے ہیں یعنی غفلت کی وجہ سے ہم کو عرصہ سے اس کی طرف توجہ و التفات نہیں تھا اس لیے وہ ذہن میں مستحضر نہ تھا اور اس عارض کی وجہ سے کوئی مضمون نیا اور انوکھا ہو جاتا ہے ورنہ (حقیقتاً) کوئی مضمون نیا اور انوکھا نہیں۔

اور سلامتی کی بات بھی یہی ہے کہ نیا مضمون بیان نہ کیا جائے کیونکہ اب نیا مضمون وہ ہوگا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل نہ ہوا ہو، نہ حقیقتاً نہ حکماً۔ بلکہ محض رائے سے گھڑ لیا گیا ہو اور یہی تو بدعت ہے جو قابل ترک ہے۔ (اس) اعتبار سے جدید مضمون ہونا مضر ہے کیونکہ جدید وہ ہوگا جو بدعت اور دین سے خارج اور زائد ہو اور جو پہلے سے دین کا جزء ہو۔ وہ تو قدیم ہی ہوگا لہٰذا جدید مضمون کا علی الاطلاق انتظار کرنا غلطی ہے۔

یہ میں نے اس لیے کہہ دیا کہ بعض لوگ نئے مضامین کے مشتاق ہوا کرتے ہیں۔ سو خوب سمجھ لیجئے کہ جو مضمون وجود اور وقوع کے اعتبار سے نیا ہو وہ قابل ترک ہے اور جو استحضار کے اعتبار سے نیا ہو کہ اب تک اس کی طرف سے غفلت تھی۔ وہ البتہ قابل اشتیاق ہے۔

(دعوت و تبلیغ، آداب التبلیغ ص۴۴، التواصی بالحق ص۵۷)

بیان میں ایک گونہ نیا مضمون اور نیا فائدہ ہونا بہتر ہے

ہر چند کہ بیان میں کوئی نیا مضمون ہونا ضروری نہیں مگر عام لوگوں کا طبعاً یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وعظ میں کوئی نیا مضمون ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں جی لگتا ہے اس مصلحت کا لحاظ کر کے فی الجملہ (کچھ نہ کچھ) جی چاہا کرتا ہے کہ بیان میں ایک گونہ جدت (نیا پن) ہو تو اچھا ہے۔ خواہ جدید اس اعتبار سے ہو کہ اب تک سامعین کو بالکل ہی معلوم نہ ہوا۔ یا توجہ کے درجہ میں جدید ہو یعنی معلوم تو ہے مگر ادھر توجہ نہیں رہی اس لیے بیان میں اس خاص جدت کے اعتبار سے رعایت کی جاتی ہے کہ کوئی نیا مضمون ہو ورنہ جدید ہونے کی ضرورت نہیں حتیٰ کہ اگر کسی قسم کی بھی جدت نہ ہو خواہ بالذات یا بالعرض بیان پھر بھی مفید ہوتا ہے۔

مگر تاہم عموماً (لوگوں کا) طبعی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ایسی بات بیان ہو جو پہلے سے ذہن میں نہ تھی خواہ حصول کے اعتبار سے کہ وہ چیز ذہن میں حاصل ہی نہ تھی یا ذہول کے اعتبار سے کہ حاصل تو تھی (یعنی علم تو تھا) مگر اس سے ذہول (غفلت) ہو گیا تھا۔ اس کی طرف توجہ نہ تھی تو اس طبعی تقاضے کو دیکھ کر بعض دفعہ جی چاہا کرتا ہے کہ اگر اس کی رعایت کی جائے کہ مضمون نے میں گونہ جدت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ یہ مضمون خاص اعتبار سے نیا ہے۔ (آداب التبلیغ صہ ۲۶)

(جو مجھے بیان کرنا ہے) وہ مضمون دیگر نصوص صریحہ میں منصوص ہے۔ اور اس کا مقتضایہ تھا کہ اس وقت میں انہی آیات کی تلاوت کرتا جن آیات کی دلالت اس مضمون پر صریح ہے۔ مگر اس کو تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کوئی نئی بات معلوم نہ ہوتی۔ جی چاہا کرتا ہے کہ بیان میں افادہ جدیدہ (نیا فائدہ) ہو

اس لیے میں نے ان آیات کو جدید فائدے کے لئے تلاوت کیا ہے تاکہ ان سے اس مضمون پر ایک لطیف استشہاد ہو سکے۔ اس لطافت کی غرض سے میں نے ان آیات کو بیان کے لئے اختیار کیا ہے۔ (آداب تبلیغ ص۲۶)

وعظ و تقریر میں کیسی روایات اور مضامین نہیں بیان کرنا چاہیئے

ایک صاحب نے لکھا کہ ایک واعظ صاحب نے یہاں بیان کیا کہ انبیاء علیہم السلام کا بول و براز (پیشاب پاخانہ) پاک ہوتا ہے اور خصوصاً ہمارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات پاک تھے کیونکہ آپ سراپا نور تھے اور انبیاء علیہم السلام کے بول و براز کو زمین فوراً ہضم کر جاتی تھی ان روایات کے متعلق جناب کی کیا تحقیق ہے؟

جواباً فرمایا کہ خواہ مخواہ انہوں نے ایسی باتیں بیان کر کے پریشان کیا جو نہ عقائد ضروریہ میں سے ہیں نہ احکام میں سے اور وعظ میں بیان کرنے کی چیز عقائد و احکام ہیں نہ کہ ایسی روایات جن پر دوسری قومیں ہنسیں۔

ایسی روایات بسند ضعیف آئی ہیں اس لیے نہ ان کی تصدیق واجب نہ تکذیب۔ لہٰذا ایسے امور میں مشغول ہی نہ ہونا چاہیئے۔ نہ تصدیقاً نہ تکذیباً۔ ہاں فضائل میں ایسے مضامین کی کھپت ہو سکتی ہے۔

اور ایسے واعظوں کا وعظ ہی کیوں سنا جاتا ہے اور ان سے سند کا (حوالہ) مطالبہ کیوں نہیں کیا گیا کہ اسی جلسہ میں حقیقت کھل جاتی۔

(ملفوظات اشرفیہ ص۲۹۵)

عوام کے مجمع میں بیان کرنے میں ضروری احتیاط متوحش مضامین سے احتراز

اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگدست یا تہی دست نہیں بنایا تھا آپ کا فقر و ترک اختیاری تھا۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اہانت کی صورت سے بھی بچایا ہے اسی واسطے محققین نے مشورہ دیا ہے کہ کم فہم عوام، جہلاء کے مجمع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فاقے وغیرہ کا بیان نہ کرے۔ بلکہ ایسے عوام کے سامنے وہی مضامین بیان کرنا چاہیئے جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان و شوکت ظاہر ہوتی ہو۔ ان کے سامنے فقر و فاقہ کے مضامین بیان نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں احتمال ہے کہ ان کے قلوب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت نکل جائے۔

میرے ایک دوست مولوی منت اللہ ہیں انہوں نے ایک گاؤں میں یہ بیان کر دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی نعلین (جوتے) مبارک کے ساتھ نماز پڑھتے تھے ایک مرتبہ جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ نعلین مبارک میں نجاست بھری ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (نعل) نکال ڈالا۔ فی نفسہ واقعہ تو صحیح ہے مگر لوگ بگڑ گئے کہ تو کیسا بدعقیدہ ہے۔ کہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین مبارک نجس ہو سکتی ہے۔ خیر تھا تو ان کا جہل مگر ناشی (پیدا) تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اعتقاد سے۔ مولوی صاحب نے مجھ سے شکایت کی میں نے کہا ایسی جگہ آپ

کو ایسی بات نہ کہنا چاہیئے تھی اس میں فتنہ کا احتمال ہے۔
غرض علماء محققین نے تصریح کی ہے کہ عوام کے مجمع میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فقر و فاقہ کو نہ بیان کرنا چاہیئے۔ تاکہ قلوب میں عظمت باقی رہے۔ مگر جہاں فہیم (سمجھ دار لوگ) ہوں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ (ضرور بیان کرنا چاہیئے) البتہ جہاں کے لوگ کم فہم ہوں وہاں ہرگز نہ بیان کرنا چاہیئے۔ جیسے بعض جہلاء کا قصہ سنا ہے۔ کہ یورپ کے کسی دیہات میں وہاں کے لوگوں سے پوچھا گیا تم کون قوم ہو ؟ کہا مسلمان۔ کس کی امت میں ہو؟ کہا کہ ایک راجہ پچھاں میں گجرو ہے (یعنی گذرا ہے) ہم وا کی (یعنی اس کی) امت میں ہیں۔ ان لوگوں کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش کیا ہے۔ اسم گرامی کیا ہے۔ اجمالاً اتنا جانتے تھے کہ پچھاں میں راجہ ہوئے ہیں۔ اگر ان نادانوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فقر و فاقہ کی حالت بیان کی جائے تو جو عظمت راجہ ہونے کی خیال سے ہے وہ بھی جاتی رہے گی اس لیے قوی احتمال ہے کہ اس قسم کے لوگ برائے نام بھی اسلام سے منحرف ہو جائیں گے (روح الجواد ملحقہ برکات رمضان ص۲۴۲)

عوام کے مجمع میں اسرار و حکم نہیں بیان کرنا چاہیئے

فرمایا احکام شرعیہ کی علت عوام کے سامنے ہرگز نہ بیان کرنا چاہیئے بلکہ ضوابط کی پابندی کرانا چاہیئے ورنہ خطرہ کا قوی اندیشہ ہے۔ علماء کو چاہیئے کہ عوام کے سامنے دلائل و حکم نہ بیان کریں۔ یہی میرا طرز ہے۔ چنانچہ علی گڑھ میں ایک پروفیسر صاحب نے جو عربی ادب کے ماہر تھے مجھ سے ایک حدیث کا متن پڑھ کر جس میں آیا ہے کہ زنا کی کثرت سے طاعون پھیلتا ہے سوال کیا کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی

میں نے کہا حدیث کا مدلول (مطلب) سمجھ میں نہیں آیا یا جنایت اور عقوبت میں ربط کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ کہا ربط سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا کہ ربط کے سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے اس پر کوئی دین کا کام نہیں اٹکا ہوا ہے آپ بغیر علم ربط ہی کے حدیث پر ایمان رکھئے، کہا اس میں ایک نفع ہے۔ میں نے کہا وہ کیا، کہا اطمینان کی زیادتی، میں نے کہا خود اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل ہے، کہا اس کی دلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ ولٰکن لیطمئن قلبی میں نے کہا یہ کیا ضروری ہے کہ جو چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نافع تھی وہ آپ کو بھی نافع ہوگی بس اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ علماء کو عوام کے ساتھ یہی طرز اختیار کرنا چاہیئے کہ دلائل و حکم اور اسرار ان کے سامنے بیان نہ کریں اس سے ان کا دماغ خراب ہوتا ہے پھر وہ کوئی حکم بغیر علت و حکمت معلوم کیے قبول نہ کریں گے اور بعض احکام کی علتیں و حکمتیں دقیق ہوتی ہیں بیان کے بعد بھی عوام ان کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہاں یا تو عوام عمل ترک کر دیں گے یا علماء علت و حکمت سمجھانے میں اپنا دماغ اور وقت ضائع کریں گے اس سے بہتر یہی ہے کہ عوام کے سامنے صرف احکام بیان کیئے جائیں یہ تو علماء کا کام ہے۔ اور عوام کا فرض یہ ہے کہ علماء کا اتباع کریں ان سے احکام دریافت کریں علت و حکمت دریافت نہ کریں۔ (اتباع علماء ملحقہ دعوت و تبلیغ ص ۳۵۳)

وعظ و تقریر میں لوگوں کے نشاط کی رعایت

عبادت وہی بہتر ہے جو نشاط کے ساتھ ہو۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہفتہ میں ایک مرتبہ وعظ فرمایا کرتے تھے

لوگوں نے عرض کیا حضرت ہفتہ میں دو بار فرمایا کیجئے۔
فرمایا کہ کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یتخولنا بالموعظۃ
یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گاہ گاہ وعظ سے ہماری خبرگیری (اور رعایت) فرمایا کرتے تھے اور ایسا اس لیے فرماتے تھے کہ لوگوں کو ملال نہ ہو اور لوگ بھاگیں نہیں۔ (التہذیب ص۱۹۲ ملحقہ حقوق وفرائض)

لوگوں کے نشاط کے واسطے دورانِ وعظ باآواز بلند درود شریف پڑھوانا۔

سوال:۔ ہمارے یہاں ایک مولوی صاحب وعظ کہتے ہیں۔ دورانِ وعظ جب سامعین کے مزاج میں سستی و کاہلی آجاتی ہے۔ تو مولوی صاحب درود پاک باآواز بلند خود بھی پڑھتے ہیں اور لوگوں سے پڑھواتے ہیں بعض مولوی صاحبان اس کو منع کرتے ہیں آخر اس میں تحقیق کیا ہے مطلع فرمائیں۔
الجواب:۔ (گنجائش نہیں سمجھ میں آتی وجہ اس کی یہ ہے کہ) نشاط کا آثار ذکر سے کرنا اس کی جواز کو مستلزم نہیں کہ نشاط کو اس کی غایت بھی قرار دیا جائے جیسا کہ صورۃ مسئولہ میں مقصود ہے۔
فقہاء نے تصریحاً لکھا ہے کہ اگر چوکیدار اس قصد سے ذکر جہر کرے (اللہ اکبر کہے) تاکہ نیند جاتی رہے تو ناجائز ہے باوجودیکہ ایقاظ (بیداری) کو آثار و فوائد میں سے فرمایا ہے مگر پھر بھی اس کا غایت بنانا درست نہیں
(امداد الفتاوی ص۲۲۳ ج ۵)

مقررین اور واعظین کیلئے ضروری ہدایات اور تنبیہات

(۱) وعظ میں بات صاف کہے کہ سننے والوں کو خوب سمجھ میں آجائے۔ خشونت اور اشتعال انگیز طرز سے بچے۔

(۲) بلا ضرورت اختلافی مسائل بیان نہ کرے۔ اور ضرورت ہی پڑ جائے تو عنوان نرم اور سہل ہو۔

(۳) اگر کسی شخص کا نام لینا ہو تو اس کی نسبت کوئی سخت کلمہ نہ کہے بس متانت (سنجیدگی) سے شبہ حل کردے خواہ کوئی مانے یا نہ مانے۔

(۴) سیاسی امور یا کسی کے ذاتی معاملات کے فیصلہ میں واعظ دخل نہ دے اگر اس کی درخواست بھی کی جائے تو صاف انکار کردے۔

(۵) کسی کو تعویذ گنڈے دینے یا بیعت لینے سے واعظ کو قطعاً منع کر دیا جائے اگرچہ اس کا وہ اہل بھی ہو۔ (تجدید تعلیم و تبلیغ ص۱۸۹)

(۶) عام طور پہ واعظ کسی کی دعوت قبول نہ کرے البتہ اگر داعی پہلے سے شناسا (جانا پہچانا) اور مخلص ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یا شناسا نہ ہو مگر قرائن سے مخلص ہونا معلوم ہوتا ہو تو بھی مضائقہ نہیں ہے (تجدید تعلیم ص۱۸۹)

(۷) دعوت میں خود ہی سادہ کھانا تجویز کر دیا کریں۔ (حسن العزیز ص۳۰ ج ۴)

(۸) نقد و غیر نقد ہدیہ ہرگز قبول نہ کرے (تجدید تعلیم ص۱۸۹)

(۹) وعظ پر عوض (نذرانہ) نہ لے۔ (اصلاح انقلاب ص۲۳)

(۱۰) کسی مدرسہ یا انجمن کے لئے چندہ کی ہرگز ترغیب نہ دے بلا ترغیب کوئی دے تب بھی انکار کردے پھر بھی نہ مانے تو کہہ دے کہ براہ راست مرکز میں بھیج دو میں نہیں لیتا۔ (تجدید تعلیم ص۱۸۹)

وعظ تقریر سے متعلق چند کوتاہیاں۔

(۱) وعظ میں غیر ضروری یا عوام کے لئے مضر مضامین بیان کرنا مثلاً مسائل غریبہ اور دقائق تصوف بیان کرنا۔

(۲) وعظ میں کسی کی فرمائش کے تابع بن جانا۔

(۳) وعظ میں مغلق تقریر کرنا۔

(۴) کسی خاص شخص پر وعظ میں تعریض کرنا جس سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہے،

(۵) وعظ کہہ کر نذرانہ لینا یا پہلے سے ٹھہرا لینا۔ (حقوق العلم ص۹۳)

بعضے واعظ وعظ کہہ کر نذرانہ لیتے ہیں بلکہ پہلے ہی نرخ طے کر لیتے ہیں۔

(۶) بعضے واعظ شہرت کے لئے وعظ کہتے ہیں۔ (اصلاح انقلاب ص۵)

مقرر اور واعظ کیلئے ضروری آداب وہدایات

(۱) واعظ کیلئے عادل (منصف) اور حدیث وتفسیر جاننے والا ہونا ضروری ہے۔

(۲) سلف صالحین کے واقعات اور ان کے حالات سے معتدبہ مقدار میں واقفیت بھی ضروری ہے۔

(۳) مستحب ابہتر یہ ہے کہ واعظ ومقرر بامروت اور وجاہت والا ہو۔

(۴) مستحب یہ ہے کہ مقرر فصیح اللسان ہو اور لوگوں کی فہم اور ان کی ذہنیت اور صلاحیت کے اعتبار سے گفتگو کرتا ہو۔

(۵) ایسے حالات میں وعظ تقریر نہ کرے جبکہ لوگوں کی طبیعت میں ملال اور اکتاہٹ کے آثار ہوں۔

(۶) بلکہ وعظ وتقریر اس وقت کرے جبکہ لوگوں میں رغبت پائی جائے

اور ایسے وقت وعظ ختم کردے جبکہ ان میں رغبت باقی ہو۔

(۷) وعظ تقریر روزانہ پابندی سے نہ کرے بلکہ ناغے بھی کیا کرے (تاکہ رغبت داشتیاق باقی رہے)۔

(۸) مناسب یہ ہے کہ مقرر پاک صاف جگہ وعظ کہے۔

۹۔ وعظ شروع کرنے سے پہلے اللہ کی حمد اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے

(۱۰) وعظ ختم ہونے پر بھی حمد وصلوٰۃ کرے اور تمام مسلمانوں کے لئے اور خصوصاً حاضرین مجلس کے لئے دعاء خیر کرے۔

(۱۱) صرف ترغیبی و ترہیبی مضامین ہی بیان نہ کرے۔

(۱۲) وعظ تقریر میں آسانی بتلانے والا ہو تنگی میں ڈالنے والا نہ ہو۔

(۱۳) وعظ تقریر میں عمومی خطاب کرے کسی خاص گروہ اور جماعت کو نشانہ نہ بنائے۔

(۱۴) خاص کسی قوم اور جماعت کی مذمت اور شخصی طور پر کسی پر انکار نہ کرے

(۱۵) گھٹیا قسم کی تہذیب سے گری ہوئی باتیں اور ہنسی مذاق نہ کرے۔

(۱۶) اچھائیوں کا حکم دے۔ برائیوں سے روکے۔

(۱۷) اہم اور پیچیدہ مسائل سے پہلے چھوٹی چھوٹی بنیادی باتوں کو سکھلائے۔

(۱۸) اسکی تقریر کا ماخذ و مواد کتاب و سنت اور صحابہ کے اقوال اور اس کے علاوہ صالحین کے اقوال و حالات ہوں۔

(۱۹) موضوع، روایات، بے سند مشہور قصے اور کربلا اور وفات اور اس جیسے مضامین بیان نہ کرے۔

(۲۰) ترغیب و ترہیب میں مبالغہ سے کام نہ لے۔

(۲۱) دقیق بحثوں اور مجمل کلام سے احتراز کرے۔

(۲۲) اپنے کلام کا دو یا تین بار اعادہ کرے (تاکہ سامعین اچھی طرح

سمجھ لیں) ۔ (تلخیصات عشر ترجمہ شدہ الدرس التاسع ص۱۹۷)

وعظ سننے کے آداب

۱) وعظ سننے والوں کو چاہیے کہ وعظ و تقریر کرنے والے کی طرف رخ کر کے بیٹھیں۔

۲) دوران تقریر بیکار کام، اِدھر اُدھر تکنا، لہو و لعب کرنا وغیرہ ان سب باتوں سے احتراز کرے۔

۳) دوران وعظ کسی قسم کی گفتگو نہ کرے۔

۴) اگر کوئی شبہ پیش آئے یا کوئی سوال پیش آئے اس وقت خاموش رہے اس کی گفت گو ختم ہونے کے بعد دریافت کر لے۔

۵) اگر دقیق مسئلہ دریافت کرنا ہو تو سب کے سامنے نہیں بلکہ خلوت میں دریافت کرے۔ (تلخیصات عشر ص۱۹۸)

وعظ کس نیت سے سننا چاہیئے

آج کل وعظ سننے والوں کے مختلف مقاصد ہوا کرتے ہیں یعنی لوگ تو اس لیے وعظ سننے آتے ہیں کہ واعظ کی تقریر کا اندازہ کریں کہ وہ کس قبیل کی ہے۔ مسلسل بیان ہوتا ہے یا اکھڑا اکھڑا ہوتا ہے۔ مضامین کی آمد (اور علمی لیاقت و قوت گویائی) کا کیا حال ہے۔ بعض لوگ اس لیے وعظ سنتے ہیں کہ مضامین سن کر واعظ کے خیالات کا اندازہ کریں گے کہ کس خیال کا آدمی ہے اور بعض لوگ اس لیے آتے ہیں کہ اس کے بیان اور مضامین میں عیب نکالیں گے۔ (اور بعض لوگ محض شوق اور لطف

کی بنار پر وعظ سنتے ہیں اور بعض لوگ محض عادت کی بنار پر سنتے ہیں) اور بعض لوگوں کی نیت اچھی بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ مجلس وعظ میں شریک ہونے سے اتنا وقت ثواب کے کام میں گذرے گا۔ یہ نیت اگرچہ مستحسن ہے (پسندیدہ ہے) لیکن کافی نہیں کیونکہ وعظ سننے سے مقصود ثواب نہیں ہوتا۔ ثواب تو نفلوں میں تلاوت قرآن مجید میں بھی بہت ملتا ہے۔ وعظ سننے کی اصل غرض یہ ہے کہ وہ امراض باطنی جن پر کبھی ہماری نظر نہیں جاتی ان کو سُنیں اور ان پر ہم کو توجہ ہو۔ اس غرض کو پیش نظر رکھ کر وعظ سُننا چاہیئے۔ (دعوت عبدیت وعظ انسداد بدعت ص۲۸ ج ۵)

دیہاتوں میں جا جا کر وعظ کہنے کی زیادہ ضرورت ہے۔

فرمایا میرا یہ مدتوں سے یہ خیال ہے کہ دیہاتوں میں وعظ کا اہتمام ہو وہاں کے لوگ بہت جلد حق قبول کر لیتے ہیں۔ ان کو اس سے بہت نفع ہوتا ہے۔ کچھ واعظ خاص طور سے دیہات ہی میں جا جا وعظ کہا کریں اور نذرانہ بالکل نہ لیں۔ نہ کسی کی دعوت قبول کریں۔ اس کا بہت اثر ہوتا ہے۔ ان بیچاروں کو سادے سادے وعظ ہی کافی ہیں۔ بہت لمبے چوڑے اور مدلل مضامین کی ضرورت نہیں ہے (حسن العزیز ص۳۹۲ ج ۱)

علمار کو بھی چاہیئے کہ دیہات والوں کی تعلیم کی طرف توجہ کریں اس میں ایک فائدہ یہ ہے کہ اگر تم ان کو تعلیم یافتہ بنا دوگے تو وہ کسی کے دھوکہ میں نہ آئیں گے ورنہ کوئی دوسرا جاہل واعظ ان کو بہکا دے گا۔ پھر جو وقعت آج تمہاری گاؤں میں ہو رہی ہے وہ سب جاتی رہے گی چنانچہ ایسے قصے بہت پیش آتے ہیں۔

(التبلیغ ص۱۴۲ ج ۲۱)

شہریوں اور دیہاتیوں میں وعظ کہنے میں فرق

میں دیہاتوں میں جو وعظ کہتا ہوں تو بالکل سہل اور بہت آسان اور شہریوں میں اس طرح نہیں کہتا بلکہ قدرے عقلیات کے رنگ میں کہتا ہوں۔ (عقلی دلائل بھی بیان کرتا ہوں) کیونکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت کے مضامین مدلل نہیں ہیں علماء خواہ مخواہ منوانا چاہتے ہیں خصوصاً جہاں نئی تعلیم کے لوگ ہوتے ہیں وہاں خوب جوش ہوتا ہے جی چاہتا ہے کہ خوب مدلل طور سے بیان ہوتا کہ یہ لوگ شریعت کو معمولی نہ سمجھیں۔ (حسن العزیز ص۲۸۰ ج ۱)

بازاروں اور ناقدری کے مجمع میں وعظ نہیں کہنا چاہیئے۔

فرمایا کہ بازاروں میں وعظ کہنے کا اچھا اثر نہیں ہوتا۔ میں بھی پہلے کہا کرتا تھا۔ مگر وعظ کہنے کی وقعت نہیں ہوتی۔ جیسی کہ مسجد وغیرہ میں بیان کرنے سے ہوتی ہے البتہ اگر تبلیغ نہ ہو چکی ہوتی تو ضرورت تھی اس بات کی کہ میلوں ٹھیلوں وغیرہ میں سب جگہ وعظ کہنا پڑتا۔ (جیسے انبیاء علیہم السلام کرتے تھے۔) (حسن العزیز ص۲۲۹ ج ۴)

باب ۵ .... ضروری آداب

وعظ تقریر میں فقہی مسائل بیان کرنے سے احتراز

پہلے مجھے یہ خیال ہوا کرتا تھا کہ پرانے علماء اپنے وعظ میں ترغیب وترہیب کے مضامین کے علاوہ مسائل فقہیہ نہیں بیان کرتے تھے اس کی کیا وجہ تھی۔

ایک مرتبہ میں نے لکھنؤ میں تین چار مسئلے سونے چاندی کے زیور کی خرید فروخت کے متعلق اپنے وعظ میں بیان کیے۔ جب لوگ وہاں سے منتشر ہوئے تو انہوں نے ان مسائل کا اعادہ کیا اور پورا ضبط نہ رہنے کی وجہ سے ایک مسئلہ کو دوسرے میں مخلوط کر کے آپس میں اختلاف کیا۔ پھر معاملہ میرے سامنے تک آیا تب مجھے خیال ہوا کہ واقعی یہی وجہ تھی علماء کے وعظوں میں مسائل فقہیہ نہ بیان کرنے کی کہ لوگ ان میں خلط ملط اور گڑبڑ کر لیتے ہیں۔ (حسن العزیز صـ۱۸۴ جلد ۲)

وعظ میں مسائل فقہیہ کا بیان کرنا علماء کی بالکل عادت نہیں ہے۔

حالانکہ بظاہر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے ایک وعظ میں صرف چار پانچ ربوٰ کے مسائل جو عموماً پیش آتے ہیں بیان کر دیئے بعد میں مختلف لوگوں نے ان مسائل کی بابت مختلف باتیں بیان کیں۔ معلوم ہوا کہ اختلاف ہو گیا اس وقت سمجھ میں آیا کہ علماء نے جو اس کا اہتمام نہیں کیا انہوں نے اس کی مضرت کو معلوم کر لیا تھا۔ (حسن العزیز صـ۹ ج ۱)

اس لیے مناسب یہی ہے کہ جب لوگوں کو کوئی معاملہ پیش آئے تو وہ علماء کے سامنے بیان کریں اور اس وقت ان کو اس کے متعلق جواب دیا جائے۔ پہلے سے بتانا ٹھیک نہیں کہ یوں ہو تو یوں کرنا اور اس طرح ہو تو یہ حکم ہے اس سے آدمی گڑبڑی میں پڑجاتے ہیں۔

(حسن العزیز صد۱۸۲ ج ۲)

عوام کو تو ثواب و عذاب ہی بتانا چاہیئے۔ اور مسائل پوچھ پوچھ کر عمل کرلیا کریں۔ (الفصل للوصل صد۲۰)

وعظ تقریر میں کیسے مسائل بیان کیئے جاسکتے ہیں۔

بجز کسی کھلے مسئلہ کے مسائل دقیقہ کا بیان کرنا عام مجمع میں مصلحت کے خلاف ہے۔ ایسے مسائل کو حدوث واقعہ کے وقت بتلادے تاکہ اس کے اوپر آسانی کے ساتھ منطبق کیا جاسکے۔ برخلاف اس کے کہ وعظ میں فرض کرکر کے جواب دیئے جائیں گے۔ تو بعد میں وہ سوال تو غائب ہوجائے گا اور جواب میں خواہ مخواہ شبہے پڑیں گے اور لوگ گڑبڑ کرلیں گے۔ اسی مصلحت کی بناء پر علماء وعظ میں صرف ترغیب و ترہیب ہی کے مضامین بیان فرماتے ہیں۔

(حسن العزیز صد۹۱ ج ۱)

عورتوں کے مجمع میں شرمناک مسائل واحکام نہیں بیان کرنا چاہیئے۔

بعضے واعظوں کو دیکھا ہے کہ غضب کرتے ہیں صاف کہہ ڈالتے

ہیں۔ ایک ہمارے ہم سبق تھے عورتوں نے ان کے وطن میں ان سے وعظ کے لئے کہا۔ وعظ میں آپ نے کہا کہ عورتوں کو بھی ختنہ کرانا چاہئیے۔ یہ سُن کر عورتیں بہت بگڑیں اور ان کو خوب گالیاں دیں کہ اپنی ماں کا کرا۔ اپنی بہن کا کرا۔ انہیں پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ یہ خبر دیوبند پہنچی میں نے کہا تمہیں یہ کیا شامت سوار ہو گئی تھی۔ یہ کون سی عقلمندی تھی کہ عورتوں میں ایک ایسا مسئلہ بیان کرنا بیٹھ گئے ہیں مثل مشہور ہے ؎
"یک من علم را دہ من عقل می باید۔" (ایک من علم کے واسطے دس من عقل چاہیئے) ؎ (حسن العزیز ص۸۷ ج ۱)

کوئی مسئلہ بیان کرے تو پورا مسئلہ اور اس کی حقیقت بھی بیان کردے۔

جیسے ایک گاؤں میں ایک گشتی واعظ صاحب آئے اور انہوں نے بیان کیا کہ جب تک نیت نہ کرے روزہ نہیں ہوتا اور نیت بتائی کہ یوں کہنا چاہیئے۔ بِصَوْمِ غَدٍ نَوَيْتُ۔ کوئی ایسے کھانے کمانے والے واعظ ہوں گے ورنہ نیت کی حقیقت بھی بیان کر دیتے۔ اگلے دن کیا دیکھتے ہیں کہ دن میں چودھری صاحب بے دھڑک حقہ پی رہے ہیں۔ کہا مردود رمضان ہے تو نے روزہ نہیں رکھا۔ کہا مولوی جی خفا مت ہو تم ہی نے تو یہ مسئلہ بیان کیا تھا کہ بے نیت کے روزہ نہیں ہوتا اور جو نیت تم نے بتائی تھی وہ مجھے یاد نہیں ہوئی اب اسے یاد کر کے روزہ رکھوں گا۔ آج میں نے سوچا کہ روزہ تو ہوا ہی نہیں پھر حقہ کا ذائقہ کیوں چھوڑوں۔

اس حکایت کو سن کر ہم لوگ ہنستے ہیں اور اس روزہ نہ رکھنے والے کو گنوار سمجھتے ہیں۔ مگر انصاف سے کہیئے کہ اس میں قصور کس کا ہے؟ قصور واعظ کا ہے کہ بات کہی مگر ادھوری مسئلہ اس طرح بتایا کہ اس گنوار سے اس پر عمل نہ ہو سکا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس طرح تو میرے بس کا نہیں تو عمل ہی کو چھوڑ دیا۔ (التبلیغ ص۱۹ ج ۰)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بیان کرنے میں غلو اور دوسرے انبیاء کی تحقیر

ایک شاعر صاحب ہیں انہوں نے نعت لکھنے کے لئے روشنائی تجویز کی ہے اور یعقوب علیہ السلام کی آنکھ کو اس روشنائی کے حل کرنے کے لئے کھرل قرار دیا ہے۔ وہ شعر مجھے اس وقت یاد نہیں رہا۔
سچ بتلایئے ایمان سے اگر انبیاء علیہم السلام کو کسی موقع پر مجتمع پائیں اور وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف فرما ہوں تو اس مجمع میں ہم ان اشعار کا تکرار کر سکتے ہیں؟ کیا یعقوب علیہ السلام کی آنکھ میں روشنائی پیس سکتے ہیں؟ یا ان کے منہ پر ایسی بات کہہ سکتے ہیں؟ جو بات منہ پر کہنا بے ادبی قرار دی جائے کیا پیچھے کہنا گستاخی نہ ہوگی کسی نے خوب رد کیا ہے اس شعر کا ؎
ابھی اس آنکھ کو ڈالے کوئی پتھر سے کچل :: نظر آتا ہے جسے دیدۂ یعقوب کھرل
انبیاء علیہم السلام کی شان میں تو ایسے اشعار نقل کرتے ہوئے بھی پریشانی ہوتی ہے۔
(۲) بعض مقررین کہتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے جس طرح یوسف

علیہ السلام کو رخصت کرتے وقت یہ سوچ کر کہ یوسف مجھ سے جدا ہوتے ہیں میرے دل کو تسلی کیسے ہوگی۔ پیراہن رکھ لیا کہ اسی کو دیکھ لیا کروں گا۔ اسی طرح نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجنا چاہا تو سوچا کہ کیسے تسلی حاصل کروں گا۔ اس لیے سایہ رکھ لیا کہ اس سے تسلی ہو جایا کرے گی۔ الٰہی توبہ۔ الٰہی توبہ۔ انصاف کیجئے کہ ان مضامین کے بعد کیا ایمان باقی رہ سکتا ہے۔ اس شعر میں حق تعالیٰ کے لئے بے چینی ثابت کی ہے۔ پھر خدا کے بصیر ہونے کا انکار کیا ہے ورنہ جب اللہ تعالیٰ خبیر و بصیر ہے تو خود حضور کو دیکھ لیا کرتے پھر سایہ رکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ کیا ایسی محفل اور ایسے بیانات سے) مواخذہ نہ ہوگا

(۳) ایک صاحب کہتے ہیں ؎

بر آسماں چہارم مسیح بیمار ست ۔۔۔ تبسم تو برائے علاج درکار ست

حضرت عیسیٰ علیہ السلام چوتھے آسمان پر بیمار ہیں اور ان کا علاج آپ کا تبسم ہے۔ سچ بتلایئے کہ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیمار ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تبسم سے وہ اچھے ہو جائیں گے اور حقیقت میں اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ناراض کرنا ہے

(التبلیغ ص۲۹، ص۳۱ ج۰ ۱)

سیرتِ نبویہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و کمالات بیان کرنے میں ضروری ہدایات۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ہم کو وہی بیان کرنے چاہئیں

جواحادیث مذکور ہیں اور یہاں سے اس کی حکمت معلوم ہوتی ہے کہ حضور نے اپنے فضائل خود کیوں بیان فرمائے وجہ یہ ہے کہ اگر خود حضور بیان نہ فرماتے توامت اپنی طرف سے گھڑ گھڑ کر کمالات بیان کرلی کیونکہ محبت واعتقاد اس پر مجبور کرتا ہے کہ محبوب کے فضائل بیان کیے جائیں۔ اور ہمارے بیان کردہ فضائل میں یہ اندیشہ غالب تھا کہ دوسرے انبیار کی تحقیر د توہین لازم آجائے جیسا کہ آج کل مشاہدہ ہو رہا ہے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سچے اور واقعی کمالات خود ہی بیان فرما دیئے۔ تاکہ اگر کسی کو محبت وعشق کے غلبہ میں آپ کے فضائل بیان کرنیکا شوق ہو وہ ان صحیح باتوں کو بیان کر کے اپنا شوق پورا کرے اور ان فضائل کے بیان کرنے میں کسی نبی کی توہین کا شائبہ بھی نہیں ہے (التبلیغ تعیم التعلیم ص۱۳۱ ج ۲)

یہ سمجھنا چاہیئے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بات سے خوش ہوں گے جس سے دوسرے نبی کی توہین ہوتی ہو۔ آپ سمجھئے اگر آپ کا کوئی حقیقی بھائی ہو اور اس کا ایک بیٹا ہو اور وہ آپ کی شان میں گستاخی کرے تو کیا بھائی کو یہ بات پسند ہوگی۔

اسی طرح انبیار علیہم السلام آپس میں بھائی بھائی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے ہیں۔ اگر آپ نے کسی نبی کی توہین اور ان کی شان میں گستاخی کی تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خوش ہوں گے

(التبلیغ ص۳ ج ۱)

ترہیبات سے زیادہ ترغیبات کے مضامین بیان کرے

بعضے واعظ سب کو ایک طرف سے ایک ہی طرح ہانکنا شروع کر دیتے

ہیں۔ اُن کے تمام بیان میں ترہیب ہی ترہیب ہوتی ہے۔ انہوں نے ترغیب کا سبق ہی نہیں پڑھا۔ بس ان کا وعظ یہ ہوتا ہے کہ تمہاری نماز کچھ نہیں۔ تمہارا روزہ کچھ نہیں۔ تمہارا حج بیکار۔ تمہاری زکوٰۃ فضول۔ اس کا اثر یہ نہیں ہوتا کہ سننے والے نماز روزہ اور اعمال کی اصلاح کرنے لگیں گے بلکہ ہمت ہار کر جو کچھ برا بھلا عمل کرتے تھے اس کو بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

ان واعظوں کے بیان کا یہی اثر ہوتا ہے جو محض ترہیب ہی ترہیب بگھارتے ہیں اور اس کی تائید میں پرانے بزرگوں کے مجاہدوں کے قصے بیان کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ نے پانی پینا چھوڑ دیا تھا۔ فلاں بزرگ نے جوتا پہننا چھوڑ دیا تھا۔ فلاں بزرگ نے تمام عمر میں اتنے جو کھائے تھے۔ تم کیا کر سکتے ہو۔ تمہاری کیا نماز ہے۔ تمہارا کیا روزہ ہے۔ تمہارا کیا ذکر ہے۔ کیا شغل ہے۔ بس سننے والے سمجھ لیتے ہیں کہ ہم تو ہونے سے رہے اور بھلا ایسے ہوئے کسی شمار میں نہیں لہٰذا قصہ ختم کر دو کچھ بھی نہ کرو۔ (التبلیغ ص۱۹ ج ۷)

خلاصہ یہ کہ مخاطب کی رعایت کرنا نہایت ضروری اور اہل تربیت کے لئے لازم ہے اور یہ طریقہ مفید نہیں کہ جب بیان ہو تو ترہیب ہی کا ہو جیسے آج کل واعظوں کی عادت ہے۔
(التبلیغ ص۲۳ ج ۷)

اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں کرنا چاہیئے عورتوں کی ہمت افزائی۔

اگر عورتوں کو ہمیشہ دوزخی دوزخی کہا جائے گا تو دو خرابیاں ہوں گی

یا تو نماز روزہ بالکل ہی چھوڑ دیں گی یا کریں گی مگر دل بجھا رہیگا حتیٰ کہ مایوس ہو جائے گی اور خدا تعالیٰ سے مایوسی کفر ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ واعظ صاحب ممبر پر بیٹھے تو ہیں تقویٰ سکھلانے کو اور طرز بیان ایسا ہے کہ ایک مؤمن کو کافر یا قریب بکفر بنا دیا۔ اس کا دل شکستہ کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ بیچاری اپنے آپ کو خدا کی رحمت سے مایوس سمجھنے لگی ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ عورتوں کو بات بات پر دوزخی کیوں کہا جاتا ہے کیا وہ نماز نہیں پڑھتیں۔ کیا وہ روزہ نہیں رکھتیں۔ روزہ رکھنے میں تو مردوں سے بھی آگے ہیں۔ غرض جس طرح مرد عمل کرتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی کرتی ہیں۔ اگر ان کے اعمال کو بیکار کہا جاتا ہے۔ تو کیا مردوں کے سب اعمال باکار ہیں اور حقیقت پر نظر کی جائے تو عمل تو سب کے بیکار ہیں۔ حق تعالیٰ کی شان کے موافق کوئی بھی عمل نہیں کر سکتا پھر کسی فریق کو کیا حق ہے کہ اپنے اعمال کو باکار سمجھے اور دوسرے کے اعمال کو بے کار۔ اگر ایک فریق کو حق تعالےٰ کی رحمت سے بیکار اعمال قبول ہو جانے کی امید ہو سکتی ہے تو دوسرے کو کیوں نہیں ہو سکتی؟ اول تو نجات کا اصلی مدار رحمت پر ہے مگر عمل کو جتنا دخل ہے عورتیں بھی اس سے محروم نہیں۔ عورتیں بھی عمل کر سکتی ہیں اور کرتی ہیں سب کو ایک لکڑی سے ہانکنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ واعظوں کی مہربانی سے عورتوں کے ذہن میں یہ بات جم گئی ہے کہ ہمارے اعمال بالکل نکمے ہیں اور ہمارا انجام دوزخ کے سوا کچھ بھی نہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمت ہار دی اور اپنی اصلاح کی طرف توجہ بھی نہیں کرتیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ بہت بڑی غلطی ہے خدا تعالےٰ کی رحمت تنگ نہیں ہے۔ نہ کسی کے ساتھ اس کی خصوصیت ہے تمہاری نماز لنگڑی لنجی کیسی بھی سہی اگر مردوں کی نماز حق تعالےٰ کے یہاں کوئی قدر رکھتی ہے

تو تمہاری نماز بھی وہی قدر رکھتی ہے۔

عورتو! ہمت نہ ہارو۔ ایسے واعظوں کے کہنے کو مت سنو۔ حق تعالیٰ کی رحمت تم پر اسی وقت متوجہ ہو گئی جب تم کو نماز کی توفیق دے رہا تھا۔ (التبلیغ ص۱۷۲ ج ۷)

ہمارے اعمال بھی قابل قدر ہیں

تمہارا یہ کہنا کہ ہماری نماز ہی کیا؟ یہ قول بہت اچھا ہے مگر اس میں دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ ہمارا فعل ہے۔ اسی معنی کر یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ اپنی چیز کو ہمیشہ گھٹیا ہی سمجھنا چاہئے اور ایک حیثیت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہم کو توفیق دی ہے اس معنی کر یہ قول صحیح نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں وہ خدا تعالیٰ کا عطیہ ہے اور خدا تعالیٰ کی نعمت کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ نماز لنگڑی لنجی ہے اس حیثیت سے کہ عطیہ خداوندی ہے یہ بہت نعمت ہے اگر اس کی بھی توفیق نہ ہوتی تو کیا کرتے اگر ایک شخص کو روکھی روٹی ملے تو اس کو ناک مار کر کھانا کفران نعمت (ناقدری) ہے کیونکہ اگر یہ بھی نہ ملتی تو اس کا کیا بس تھا۔

اب واعظوں نے ایک حیثیت کو تو غائب کر دیا اور ایک پر نظر رکھی لہٰذا جب بیان کریں گے تو یہی کہ تمہاری نماز کیا ہے اور تمہارا روزہ کیا۔ واعظ صاحب سے کوئی پوچھے کہ آپ کی نماز میں بھی دو حیثیتیں ہیں۔ اس میں بھی اسی ایک حیثیت پر نظر کیوں نہیں رکھتے عورتوں (اور عوام) ہی کو کیوں خطاب کرتے ہو۔ کیا تمہارے نماز کیا اور روزہ کیا ہے۔ (التبلیغ کساء النساء ص۲۶ ج ۷)

اللہ تعالیٰ سے محبت ہر انسان کو ہے۔ بعض واعظین کی زبردست غلطی۔

یہ آج کل کے واعظوں کی زیادتی ہے کہ وہ مسلمانوں کو حق تعالیٰ کی محبت سے خالی سمجھتے ہیں اور وعظ میں مسلمانوں کو ملامت کرتے ہیں کہ تم کو نہ خدا کی محبت ہے اور نہ خدا کی عظمت ہے۔ سرکاری حکام کے سمّن اور طلبی (وارنٹ) پر تو تم فوراً بلا چون وچرا کے عدالت میں حاضر ہو جاتے ہو خواہ گرمی ہو یا سردی یا برسات کوئی چیز تم کو مانع نہیں ہوتی۔ اور خدا کے احکام میں سو بہانے اور حیلے نکالتے ہو۔ سو یہ دلیل غلط ہے کیونکہ رعایا کو حکام سے محبت نہیں۔ ان کے احکام شاقہ سے رعایا کو تعجب نہیں ہوتا۔ لوگ جانتے ہیں کہ حاکم غیر ہے اس سے ہم کو کیا تعلق اور وہ ہماری راحت و کلفت کا کیوں خیال کرے اس لیے ان کے احکام میں منازعت اور کشاکشی نہیں ہوتی۔ اور حق تعالیٰ کو انسان سے محبت ہے اور خاص تعلق ہے اور ان کی طرف سے جو حکم اور قید آتی ہے اس میں ناز کی وجہ سے مچلتا ہے کہ ایسے رحیم و کریم نے میرے اوپر مصیبت کیوں ڈالی۔ واعظوں نے اس فرق کو نہیں سمجھا اس لیے خواہ مخواہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت و عظمت سے خالی بتلا کر ان کے دلوں کو مجروح کرتے ہیں۔ گویا بس ایک ہی واعظ صاحب تو حق تعالیٰ کے چاہنے والے ہیں۔

واعظین اگر گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ وہ خود بھی احکام

کی خلاف ورزی کس قدر کرتے ہیں پھر بھی اپنے بیان کے موافق محبت سے خالی نہیں اور اگر وہ خالی نہیں تو عوام بھی خالی نہیں بلکہ سب کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے ہر انسان کو فطرۃً اللہ تعالیٰ سے محبت ہے اور مبتدی کو جو احکام میں منازعت ہوتی ہے یہ محبت کے خلاف نہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ محبت کی وجہ سے اس کو حق تعالیٰ پر ناز ہے یہ یوں کہتا ہے کہ جب مجھے محبت ہے تو مجھے آرام دینا چاہئے میرے اوپر یہ تکلیفیں اور یہ قیدیں کیوں ہیں اور بزبانِ حال یوں کہتا ہے ؎

ہم نے الفت کی نگاہیں دیکھیں　　جانیں کیا چشم غضبناک کو ہم

(دعوت و تبلیغ وعظ اتباع علماء ص۳۳۶)

ایک ضروری تنبیہ : شریعت محمدیہ کو کامل اور دوسری شریعتوں کو ناقص کہنا سخت غلطی ہے

اتباع کے لئے اپنے اپنے زمانہ میں ہر شریعت اگرچہ کافی تھی مگر اس وقت شریعت اسلامیہ ہی کا پابند ہونا ضروری ہے دو وجہ سے ایک تو یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ دیگر شرائع سے زیادہ کامل اور کافی ہے۔ دوسری شرائع میں تحریف بہت واقع ہوئی ہے۔ پتہ نہیں چل سکتا کہ خدا کا حکم کیا ہے اور اسی حکمت سے دوسری شریعتیں منسوخ کردی گئیں۔ اور ہمارے لیے اصل وجہ دوسرے شرائع پر عمل نہ کرنے کی بھی نسخ ہے اور وہ دونوں وجہ نسخ (منسوخ ہونے کی) حکمت ہیں۔ میں دیگر شرائع کو نعوذ باللہ ناکافی وغیرہ نہیں کہتا

جیسا کہ بعض لوگ تفاضل (و تقابل) کے وقت کہہ دیتے ہیں۔ میرا اس سے دل کانپتا ہے کہ دوسری شریعتوں کو ناکافی اور غیر کامل کہوں۔ وہ بھی اپنے مخاطبین کے لیے کافی اور کامل تھیں۔ مگر ہماری شریعت مقدسہ اکفیٰ اور اکمل ہے اور اکمل ہونا ختم نبوت کی حکمت بھی ہوسکتی ہے کیونکہ شریعت محمدیہ سے زیادہ کوئی شریعت کامل نہیں کہ اس کے بعد اس کی حاجت ہو۔

(حقوق السراء والضراء ملحقہ حقوق و فرائض ص۱۳)

تقویٰ کے متعلق غلو اور بعض واعظوں کی غلطی

بہت سے لوگ تقویٰ میں مبالغہ کرتے ہیں اور اسی کی استقامت کرتے ہیں اور اسی کو محمود سمجھتے ہیں اور بظاہر یہ محمود معلوم بھی ہوتا ہے مگر یہ محمود نہیں کیونکہ مبالغہ کی وجہ سے کسی وقت یہ شخص مایوس بھی ہوجاتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک تقویٰ کا جو اعلیٰ درجہ ہے اس کا حاصل ہونا دشوار ہے اور ادنیٰ درجہ کو یہ کافی نہیں سمجھتا۔ اس لیے اخیر میں اس کو مایوسی ہوجاتی ہے جس کا انجام تعطل ہے، مثلاً بعض واعظوں سے لوگوں نے تقویٰ کے قصے سنے ہوں گے۔ اور ہم نے بھی بچپن میں ایسے قصے دیکھے ہیں ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ طعام حلال کی تلاش میں کسی بزرگ کے پاس آیا اور کہا کہ میں آپ کے پاس طعام حلال کی طلب میں آیا ہوں۔ یہ سن کر وہ بزرگ رونے لگے اور کہا کہ اب تک تو میرا کسب (ذریعۂ معاش) حلال تھا لیکن اب نہیں رہا ایک دن میرے بیل دوسرے شخص کے کھیت میں چلے گئے تھے اس کی مٹی بیلوں کے پیر کو لگ

گئی اور میرے کھیت میں مل گئی اب مجھے شبہ ہو گیا ہے۔

ایسے قصے سن کر لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ بس تقویٰ بہت دشوار ہے حالانکہ یہ قصہ شریعت کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی۔ عقل کے خلاف تو اس لیے کہ بیل کے پیر کو جو مٹی لگ جاتی ہے وہ تھوڑی دور چلنے سے جھڑ جاتی ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ دوسرے کھیت کی مٹی اس کے کھیت میں مل گئی ہو۔ پھر اگر دوسرے کے کھیت کی مٹی ان کے کھیت میں مل گئی ہو تو ایسے ہی ان کے کھیت کی اس کے کھیت میں جا ملی ہو گی۔ تو برابر سرابر معاملہ ہو گیا پھر اگر اتنی مٹی سے شبہ ہو جایا کرے تو چاہیئے کہ جانوروں کو ہر وقت بند رکھا جائے کہیں چلنے پھرنے نہ دیا جائے حالانکہ جانور بند نہیں رہ سکتے۔

اور شریعت کے خلاف اس لیے ہے کہ حاملان شریعت نے ایسے مبالغہ کو قابل تعزیر سمجھا ہے۔ مثلاً ایک دانہ گندم کی تعریف و تشہیر کرتا پھرے کہ یہ دانہ کس کا ہے تو فقہاء کہتے ہیں کہ انہ یُعزّد کہ اس شخص کو سزائے تعزیر دی جائے کیونکہ شریعت نے اس قلیل مقدار کو قابل تعریف اور داخل لقطہ نہیں بنایا کیونکہ یہ مال نہیں۔ غرض شریعت نے ایسی قلیل مقدار کو لقطہ نہیں بنایا اور یہ شخص اس کو لقطہ بناتا ہے گویا اپنی طرف سے نئی شریعت ایجاد کرتا ہے۔

اسی طرح بیل کے پیر کو اگر مٹی لگ جائے تو کوئی قیمتی چیز نہیں چنانچہ اتنی مٹی کی بیع جائز نہیں اور جب قیمتی نہیں تو اس کا ضمان بھی نہیں پھر اس کے کھیت میں ملنے کا شبہ کیوں ہو گیا اور اگر بالفرض ضمان بھی لازم ہوتا تو اس کا ضمان ادا کر دینا کافی تھا تم نے اپنے کھیت میں سے اتنی ہی مٹی دوسرے کے کھیت میں ڈال دی ہوتی اس سے کھیت کا غلہ اور پیداوار کیوں حرام ہو گیا پس یا تو قصہ موضوع ہے یا

یہ لوگ اہل حال ہیں جو معذور ہیں یا وہ شریعت سے ناواقف ہوں گے اس لیے ایسے اقوال حجت نہیں اور واعظوں کو ایسے قصے بیان کرنا جائز نہیں اس قسم کے قصہ سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تقویٰ بہت دشوار ہے اور جب تقویٰ حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ خالص حلال نہیں مل سکتا تو جب حرام کھانے سے مفر نہیں تو تھوڑا کھایا تب کیا اور زیادہ کھایا تب کیا۔ بس اب بے احتیاطی شروع ہو گئی۔ اول ایک بے احتیاطی ہوئی پھر دوسری پھر تیسری تو پہلے شبہات سے بچنے کا اہتمام تھا اب حرام صریح سے باک نہیں یہ انجام ہے مبالغہ اور غلو کا۔ اسی لیے شریعت نے غلو سے منع کیا ہے قرآن میں امر ہے لاتغلوا فی دینکم یعنی اپنے دین میں غلو نہ کرو اور احادیث میں بھی اس کی سخت ممانعت ہے۔ من شاق شاق اللہ علیہ کیونکہ اس سے حدود سے تجاوز ہے۔ اور حدود سے تجاوز کرنا طاعت نہیں۔ بلکہ معصیت ہے شریعت نے ہر چیز کے حدود مقرر کیے ہیں۔

ایسا تقویٰ اختیار کرو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ بڑھ جائے یعنی ایسا غلو نہ کرو کہ ایسا تقویٰ کرنے لگو کہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ویسا تقویٰ نہیں کیا ہو۔

حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور العمل تو یہ آیا ہے:۔

ماخیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار الیسرھما

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک امر میں دو راستوں کا اختیار دیا جاتا تھا تو آپ سہل کو اختیار فرماتے تھے یعنی طرف مقاصد میں مشقت کو اختیار نہ فرماتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ نفس پر مشقت ڈالنا مطلقاً محمود نہیں۔ (الاستقامت ملحقہ دعوات و تبلیغ ص۲۲۰)

یہ وہ زمانہ ہے کہ آج کل مشتبہ چیز کو حلال کیا جاتا ہے نہ کہ حلال

۱۴۲

کو بھی اس میں شبہات نکال کر حرام کر دیا جائے۔ بس یہ معیار یاد رکھو کہ جس کو فقہی فتویٰ حلال کہہ دے بس وہ حلال ہے۔ (التبلیغ ص ۶۷ ج ۱۰)

واعظین کو مشورہ اور عوام کی اصلاح کا طریقہ

میں مشورہ دیتا ہوں کہ اہل تربیت کبھی سخت تعلیم نہ کریں اگر کسی سختی کی ضرورت بھی ہو تو عنوان اس کا نرم ہونا چاہیئے اس میں راز وہی ہے کہ طالب کو وحشت نہ ہو جائے اور اس کو گراں سمجھ کر اصل کام سے بھی نہ رہ جائے۔ اتنی تنگی نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ اس کو تکلیف مالا یطاق (ناقابل برداشت) سمجھ لے۔ میں بعض دفعہ دوستوں کو مستحبات کی تاکید نہیں کرتا اس وجہ سے کہ کہیں وہ تنگ ہو کر ضروریات سے بھی نہ رہ جائیں۔ اس واسطے میں کہتا ہوں کہ موقع اور محل اور مخاطب کے حالات کی رعایت کرنا نہایت ضروری ہے۔ بعض لوگ سختی کرتے ہیں اور طالبین کو مشکلات میں ڈالتے ہیں۔ میں مخاطب کی رعایت بہت کرتا ہوں حتیٰ کہ بعض وقت کسی کے ساتھ بہت نرمی کی جاتی ہے اور کسی فعل پر روک ٹوک نہیں کی جاتی۔ اور ظاہر آمداہنت معلوم ہوتی ہے۔ (التبلیغ ص ۲۱ ج ۷)

بڑے لوگوں اور نوابوں کی اصلاح کا طریقہ

ڈھاکہ میں شہر سے دور نواب صاحب کے باغ میں وعظ کہا تو وہاں زیادہ تر نواب کے خاندان کے لوگ داڑھی منڈتے تھے میں نے کہا صاحبو! یہ تو مجھے امید نہیں کہ تم میرے کہنے سے داڑھی منڈانا

۱۴۸ چھوڑ دو گے مگر اتنا تو کر لیا کرو کہ ہر روز سوتے وقت یہ خیال کر لیا کرو بلکہ یہ کلمات بھی زبان سے چپکے چپکے حق تعالیٰ سے عرض کر لیا کرو کہ اے اللہ یہ کام بہت برا ہے، اے اللہ ہم بڑے نالائق ہے اے اللہ ہم بڑے خبیث ہیں۔

غرض اپنے آپ کو خوب ملامت کرو اس سے بہت فائدہ ہوگا۔ اور بہت جلد خود داڑھی رکھوا لوگے۔ (کلمۃ الحق ص۵۶)

باکمال واعظ اور مقرر

جب میں کانپور میں تھا تو بعض احباب کی رائے یہ ہوئی کہ ایام عشرہ محرم میں لوگ ناجائز محفلوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان ایام میں بیان فرما دیا کریں تو مناسب ہے۔ میں نے یہ کام شروع کیا اور سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا بیان کیا پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کا پھر حضرت عمرؓ کا۔ پھر حضرت عثمانؓ کا پھر حضرت علیؓ کا (رضی اللہ عنہم) اسی طرح بیان کرتے کرتے آخر دن حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بیان کا نمبر آیا۔ اس دن میں نے قصداً یہ اہتمام کیا کہ میں اپنے بیان میں ایسے خشک الفاظ لاؤں جس سے کسی کو رونا ہی نہ آئے اگرچہ اس میں مجھے تعب تو بہت اٹھانا پڑا۔ مگر میں نے اس کو نباہا اور یہ بھی خیال رکھا کہ میرا قلب بھی طبعاً متاثر نہ ہونے پائے۔ چنانچہ میں نے سارا بیان ختم کر دیا اور کسی کو ذرا بھی رونا نہ آیا اور پہلے دنوں میں لوگ بیان کے وقت مچھلی کی طرح تڑپا کرتے تھے اس دن بھی بہت کچھ منہ بنایا مگر کسی کو رونا نہ آیا۔ شیعہ لوگ بھی ان بیانوں میں آیا کرتے تھے۔ سب کو بڑا تعجب

ہوا کہ آج کیا کر دیا حالت ہی دوسری ہو گئی۔ (حسن العزیز صفحہ ۱۴۰ ج ۲)

حضرت تھانویؒ کا معمول

فرمایا کہ ہمیشہ وعظ تبلیغ میں میری عادت رہی ہے کہ کتنی ہی بُری بات اور لوگوں کے مذاق کے خلاف ہو مگر عنوان نہایت نرم اور حتی الامکان ایسا رکھتا ہوں کہ دل قبول کرلے۔ لوگوں کو وحشت نہ ہو۔ نفرت نہ ہو۔ دل آزار الفاظ سے ہمیشہ اجتناب کرتا تھا۔ مخالفین کے جواب میں ہمیشہ یہی معمول رہا ہے اور اسی سے نفع ہوتا ہے۔ (مجالس حکیم الامت صفحہ ۲۱۲)

حضرت تھانویؒ کا عجیب واقعہ

ایک مرتبہ ایک قصاب کی درخواست پر میں جونپور گیا اُنہی کے مکان پر مہمان ہوا وہاں میرے پاس ایک خط پہنچا جس پر چار چیزیں میرے متعلق لکھی تھیں۔ (۱) اول یہ کہ تم جاہل ہو۔ (۲) دوسرے یہ کہ تم جلاہے ہو۔ (۳) تیسرے یہ کہ تم کافر ہو۔ (۴) چوتھے یہ کہ وعظ کرنے بیٹھو تو پگڑی سنبھال کر بیٹھنا۔ میں نے کسی سے اس خط کا تذکرہ نہیں کیا اگلے روز جب وعظ کا وقت آیا تو ممبر پر بیٹھ کر میں نے لوگوں سے کہا صاحبو! وعظ سے پہلے مجھے آپ سے ایک مشورہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مجھے یہ خط ملا ہے اس میں چار چیزیں ہیں۔ پہلے جزو کے متعلق تو مجھے اس لئے کچھ نہیں کہنا کہ یہ صاحب مجھے جاہل لکھتے ہیں اور میں خود اپنے جاہل ہونے کا معترف ہوں۔ اسی طرح دوسرے جزو کے متعلق بھی نہیں کہنا کیونکہ اول تو جلاہا ہونا کوئی عیب نہیں

اور اگر کسی درجہ میں ہو بھی تو وہ غیر اختیاری امر ہے جیسے کوئی اندھا اور کانا ہو۔ دوسرے یہ کہ یہاں میں کوئی شادی کرنے تو نہیں آیا کہ میں نسب کی تحقیق (بیان) کروں۔ تیسرے یہ کہ اگر بلا وجہ میرے نسب ہی کی تحقیق کرنا ہو تو میں اپنے زبان سے کیا کہوں۔ میرے وطن کے عمائد سے دریافت کریں کہ میں جلاہا ہوں یا کون؟

اسی طرح تیسرے جزو کے بارے میں بھی مجھے مشورہ نہیں کرنا کیونکہ پچھلی حالت کے متعلق مجھے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ میں کافر تھا یا مسلمان۔ میں اس وقت تو سب کے سامنے کلمہ پڑھتا ہوں اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ اب تو مسلمان ہو گیا اور جب تک ایمان کے خلاف کوئی بات ظاہر نہ ہو اس وقت تک مسلمان ہی کہا جاؤں گا البتہ چوتھے جزو کے متعلق مجھے آپ حضرات سے مشورہ کرنا ہے کہ وعظ میں میرا معمول ہمیشہ سے یہ ہے کہ بالقصد اختلافی مسائل بیان نہیں کرتا بلکہ حتی الامکان ان سے بچتا ہوں۔ لیکن اگر دوران تقریر میں کہیں آجاتے ہیں تو پھر رکتا بھی نہیں۔ البتہ عنوان اور ایسے الفاظ کا اہتمام کرتا ہوں کہ دل آزار نہ ہوں۔ اب اگر وعظ کہوں گا تو اسی آزادی کے ساتھ کہوں گا۔ اس کا نتیجہ پھر جو کچھ بھی ہو۔ اس لیے مشورہ طلب امر یہ ہے کہ وعظ گوئی پیشہ تو نہیں ہے اور مجھے شوق بھی نہیں لوگوں کی درخواست پر کہہ دیتا ہوں۔ اب اگر آپ حضرات درخواست کریں اور مشورہ دیں تو میں کہوں ورنہ چھوڑ دوں اور فرمایا کہ آپ کو مشورہ میں مدد دینے کے لیے میں خود اپنی رائے بھی ظاہر کیے دیتا ہوں وہ یہ کہ وعظ کو ہونے دیا جائے اور غالباً وہ صاحب بھی اس مجمع میں موجود ہوں گے جن کا یہ خط ہے وہ جس جگہ کوئی ناگواری محسوس کریں اسی وقت مجھے روک دیں۔ میں اسی وقت وعظ بند کر دوں گا یا اگر اس میں ان کو

کچھ حجاب مانع ہو تو میں آج بعد ظہر چلا جاؤں گا۔ میرے جانے کے بعد میرے وعظ کی خوب تردید کردیں۔

میں یہ کہہ کر خاموش ہوگیا اور لوگوں سے کہا کہ اپنی رائے بیان کریں۔ چاروں طرف سے آوازیں آئیں کہ آپ ضرور وعظ کہیں اور آزادی سے کہیں۔ میں نے وعظ کہا اور حسب عادت ترغیب و ترہیب اور اصول شرعیہ بیان کیے۔ پھر ضمناً بعض فروع کی بحث آئی تو اس میں بدعات و رسوم کا بھی ذکر آگیا۔ تو خوب کھل کر بیان کیا۔ تمام مجمع محو حیرت تھا۔ وعظ ختم ہونے کے بعد ایک مولوی صاحب نے کہا کہ مولانا ان سب بیان کی تو حاجت نہ تھی۔ میں نے کہا کہ مجھے اس کی خبر نہ تھی میں نے تو حاجت سمجھ کر بیان کیا۔ اگر آپ مجھے وقت پر متنبہ فرماتے تو میں بیان نہ کرتا اب تو بیان ہو چکا ہے اس کا اور کوئی تدارک اس کے سوا نہیں کہ آپ دوسرے وقت تردید فرمادیں کہ فلاں وقت اس وعظ کی تردید کی جائے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس پر کچھ نہ بولوں گا۔ (مجالس حکیم الامت ص۲۴۲)

غرض وعظ و تبلیغ میں میرا یہ طرز تھا کہ لوگوں کو وحشت و نفرت نہ ہو عنوان نرم اور انداز پسند ہو۔ آج کل لوگ اس کا خیال نہیں کرتے ہیں (مجالس حکیم الامت ص۲۴۴)

ایک ضروری تنبیہ

خواص (علماء واعظین) تک کی یہ حالت ہے کہ جب وہ کسی کے یہاں مہمان ہوتے ہیں تو کھانے کے وقت دوسروں کو بلا بلا کر کھانے میں شریک کرتے ہیں۔ اول تو دوسرے لوگوں کو چاہیئے کہ کھانے کے وقت خود ہی وہاں سے الگ ہو جائیں لیکن اگر وہ الگ نہ ہوں تو مہمان کو ہرگز جائز نہیں کہ وہ سب

کو بلا کر شریک کرے۔ آخر تم کو کیا حق ہے کہ دوسرے کے دستر خوان پر اس کی اجازت کے بغیر لوگوں کو بٹھلاؤ۔ رہا یہ کہ میزبان اس سے خوش ہوتا ہے اس کو ناگوار نہیں ہوتا یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ہر شخص اپنے مہمانوں کے اندازے سے کھانا پکاتا ہے جب زیادہ آدمی بیٹھ جائیں گے تو ضرور اس کو ناگوار ہوگا۔ اور اگر اس کو ناگوار نہ ہو تو اس کے گھر والوں کو ناگوار ہوگا کیونکہ ان کو اپنے لیے از سر نو انتظام کرنا ہوگا۔ مگر خواص کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی وہ دستر خوان پر بیٹھ کر ساری مجلس کو بلا کر شریک کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حاضرین کو نہ بلانا اور تنہا کھانا کھانا شرم کی بات ہے۔ افسوس ان کو خدا سے شرم نہیں آتی اگر ایسی ہی شرم ہے تو ان کو بازار سے دام خرچ کر کے کھانا منگانا چاہیئے۔ پھر اختیار ہے کہ جتنے آدمیوں کو چاہو بلالو۔ مگر انشاء اللہ جس دن ایسا کرنے کے لئے کہا جائے گا اس دن ایک کو بھی نہ بلائیں گے ۔ ۲۷۷ ۱۴۴

(التبلیغ ص۲۲۸ ج ۲۰)

انجمن کے سیکرٹری نے ایک واعظ کی مجھ سے شکایت کی کہ ایک دن میں گیارہ روپے کے پان کھا گئے۔ گیارہ روپے کے پان ایک آدمی کیونکر کھا سکتا ہے۔ ہوا یہ کہ جتنے آدمی ان سے ملنے آئے ان سب کو خوب پان کھلائے اس وقت تو کسی نے کچھ نہ کہا مگر بعد میں زبان پر شکایت آہی گئی۔ میں نے دل میں کہا کہ آپ جو مجھ کو کرایہ کے علاوہ زائد رقم دے رہے تھے اگر میں لے لیتا تو کل کو آپ میری بھی شکایت کرتے واقعی میزبان کو جب کلفت ہوتی ہے تو شکایت دل میں آتی ہی ہے۔ میں نے سفر خرچ کے سوا کچھ نہ لیا اور کرایہ بھی تیسرے درجہ کا۔ وہ مجھے زائد دینے لگے میں نے انکار کر دیا۔ کھانے کے اندر بھی تکلف کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس برتاؤ سے انجمن والے بڑے خوش ہوئے ۔

(التبلیغ ص۲۳۲ ج ۲۰)

حضرت تھانویؒ کا معمول

میری عادت ہے کہ جب میں سفر کرتا ہوں تو اپنے ساتھ صرف ایک آدمی کو لے لیتا ہوں اور داعی کو پہلے سے اس کی اطلاع کر دیتا ہوں تاکہ وہ آزاد رہے۔ داعی پر صرف میرا اور اس آدمی کا بار ہوتا ہے۔ پھر بعض دفعہ راستہ میں بعض لوگ محبت کی وجہ سے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ تو میں ان سے صاف کہہ دیتا ہوں کہ آپ اپنا انتظام خود کریں۔ جہاں میرا قیام ہوگا وہاں آپ قیام بھی نہ کریں۔ بلکہ سرائے وغیرہ میں جہاں آسانی ہو وہاں ٹھہریں۔ اور بازار سے اپنے کھانے کا انتظام کریں اور صبح و شام ملاقات کے لئے میرے پاس آجایا کریں۔ جس سے میزبان کو یہ نہ معلوم ہو کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔ پھر وہ اگر از خود آپ کی دعوت کرے تو آپ اپنے تعلقات کو دیکھ کر دعوت منظور کریں یا رد کریں۔ میرے طفیلی بن کر کھانا نہ کھائیں۔

اور اگر میزبان مجھ سے کہنے لگتا ہے کہ آپ کے ہمراہیوں کی بھی دعوت کرنا چاہتا ہوں تو میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ میرے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ میں نے کسی کو نہیں بلایا۔ اگر آپ نے دعوت کرنا ہو تو خود ان سے کہیئے اور محض اپنے تعلقات کی بناء پر جو چاہے کیجئے میرے اوپر اس کا احسان نہ ہوگا۔ میں ان سے کہنا نہیں چاہتا۔

میری عام عادت یہی ہے ہاں اگر کوئی بہت ہی مخلص ہوتا ہے تو وہاں میں اس قاعدہ پر عمل نہیں کرتا۔

(التبلیغ ص ۲۲۳، ص ۲۲۴ ج ۲۰)

باب ۶ ..... ضروری اصلاحات

تحریر و تقریر کے مفاسد اور طلباء کی بدحالی

عربی مدارس کے طلباء بھی نئی روشنی کے اثرات قبول کر رہے ہیں۔ پہلی سی سادگی و بے تکلفی جاتی رہی۔ وضع قطع سے مسٹر یا نیم مسٹر معلوم ہوتے ہیں نہ چہرہ پر تقویٰ کے انوار، نہ بات چیت میں تواضع کے آثار۔ کتابوں میں جی نہیں لگاتے، نہ مطالعہ سے کام، نہ تکرار سبق سے سروکار، مقرر بننے کی فکر، اخباروں اور پرچوں میں مضمون نگاری کی دھن۔ تاویل یہ کہ زمانہ کی ضرورت سے مجبوری ہے۔ کہ تبلیغ کے لئے تحریر و تقریر نئے رنگ و مذاق کی ہو اس کی ضرورت مسلّم، لیکن اس کے اندر جو خفیہ مفاسد ہیں ان پر اطلاع ضروری ہے۔ تجربہ یہ ہے کہ ایسی تحریر و تقریر بالعموم حب جاہ پیدا کرتی ہے اور اخلاص کے رنگ کو مٹاتی ہے اور طالب علمانہ زندگی و سادگی، قلب سے دور ہو کر صرف عبارت آرائی اور دعوے ہی دعوے رہ جاتے ہیں۔

۔ اس لئے عام طالب علم کو عموماً ایسی تقریر و تحریر اور نئی روشنی والوں کے ساتھ افادہ یا استفادہ کی نیت سے ملنے سے قطعاً روکا جائے کچھ اپنا رنگ چڑھانے کے بجائے خود ان کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

(تجدید تعلیم و تبلیغ ص ۸۲)

دو مفسدے

ایک مفسدہ جو واعظ کو پیش آتا ہے وہ بد عملی ہے۔ اس کی اصلاح کے بعد ایک اور مفسدہ عارض ہو جاتا ہے وہ یہ کہ وعظ اور عمل کے ساتھ ہی اس میں کبر و عُجب بھی ہو جاتا ہے کہ میں بڑا صاحب کمال ہوں کہ اللہ میاں کے تمام حقوق ادا کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ اس کے علاج کے لئے آگے تواضع کی تعلیم فرماتے ہیں وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ یعنی اس نے یہ بھی کہا کہ میں مسلمین میں سے ہوں یہاں مقصود تواضع ہی ہے۔

(التبلیغ ص۱۲۱ ج۲۰)

ایک بڑا مفسدہ

غضب تو یہ ہو رہا ہے بعضے مبلغین (مقررین) دوسری جماعت کے مبلغین کی مذمت کر کے ان ناواقف بے خبر مسلمانوں کو ان کا اتباع کرنے سے روک رہے ہیں۔ ارے بھائی اس وقت تو مشترک تعلیم اسلام کی ضروری ہے۔ عقائد اور فروع کا اختلاف پھر دیکھا جائے گا یا اسلام میں بھی دو حیثیت ہیں کہ میرا سکھلایا ہوا صحیح اور دوسرے کا سکھلایا ہوا باطل خیر تم ہی اسلام سکھلاؤ لیکن اگر خود ہمت نہ ہو تو دوسروں کو سکھلانے دو یہ کیا خرافات ہے کہ نہ خود سکھاؤ اور نہ کسی کو سکھلانے دو۔

(التبلیغ ص۶۶ ج۲۰)

میں ان طالب علموں کو چونکانا چاہتا ہوں۔ جو آج کل جدید طرز کو تقریر میں اختیار کرتے ہیں جس کی غرض زیادہ تر یہی ہے کہ جاہ اور وقعت اور عام

مقبولیت ہو۔ اسی لیے یہ کوشش ہوتی ہے کہ الفاظ پُر شوکت ہوں۔ بندشیں چُست ہوں حالانکہ اس سے خاک بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت بے باکی اور آزادی سے تقریر کرنا بھی مذموم ہے چنانچہ حدیث میں ہے الحیاء والعیُّ شعبتان منَ الایمان والبذاء والبیان شعبتان من النفاق۔ اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حیار کو بذار کے مقابلہ میں اور عی کو بیان کے مقابلہ میں فرمایا ہے۔ اور حیار اور عی کو ایک ساتھ جمع کر کے ایمان کے شعبوں میں سے قرار دیا ہے اور بذار اور بیان کو نفاق کے شعبے قرار دیا ہے۔ اس قرینہ سے معلوم ہوا کہ عی سے وہ عی مراد ہے جو کہ حیار کی وجہ سے ہے اور حیار فی نفسہ عام ہے خواہ حیار من الخلق ہو خواہ من الخالق مگر اس مقام پر مقصود حیار من اللہ ہے لیعنی ہر لفظ پر یہ سوچے کہ کہیں شریعت کے خلاف کوئی بات نہ نکل جائے ۔

(دعوات عبدیت صـ ۱۳۱ ج ۱۲)

تصحیحِ نیت

بہت معلوم ہوتا ہے کہ غرض بیان کے متعلق ایک حدیث بھی بیان کر دی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ من تعلم صرف الکلام لم یقبل اللہ منہ صرفا ولا عدلا۔ دیکھئے اس وقت نہ کوئی اس قسم کی انجمن تھی نہ مجالس کا یہ طرز تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا انتظام اسی وقت فرما دیا تھا کہ جو شخص کلام کے ہیر پھیر اس لئے سیکھے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کے قلوب مسخر کرے گا تو خدا تعالیٰ اس سے کسی نفل و فرض کو قبول نہ فرمائیں گے۔ یہ حدیث فساد غرض پر تنبیہ کرنے کے لئے بہت کافی ہے ۔ (دعوات عبدیت صـ ۱۳۱ ج ۱۲)

مقررین اور واعظین کو علم کی ضرورت۔
تقریر کے الفاظ سادہ اور آسان ہونا چاہئیے

ہم نے حضرات اہل حق کو دیکھا ہے کہ ان کے سادہ الفاظ میں وہ خوبی اور دلچسپی ہوتی ہے کہ بڑے بڑے استعاروں میں نہیں ہوتی۔ یہ جتنی شستہ اور چست تقریریں کہلاتی ہیں ان کی خوبی محض نظر اول ہی تک ہے۔ اور جس قدر زیادہ غور کرتے جائیے ان کا لوچ اور لچر اور محض الفاظ کا مجموعہ ہونا ظاہر ہوجاتا ہے کیونکہ وہاں سرمایہ علم نہیں ہوتا۔ برخلاف اہل علم کے کہ ان کے سادہ الفاظ کی یہ حالت ہوتی ہے۔

یزیدک وجھہ حسنا ۔ اذا ما زدتہ نظرا

(جس قدر تم دیکھو گے اس کا حسن نکھرتا ہی دکھائی دے گا)

میں اس وقت بعض نوجوان عربی طلبہ کو بھی دیکھتا ہوں کہ وہ بھی شریعت کی بہت باتیں چھوڑنے جاتے ہیں۔ چنانچہ کبھی خلاف تحقیق مضامین بیان کرتے ہیں۔ کہیں طرز بیان مقلدین یورپ کا اختیار کرتے ہیں اور ستم یہ ہے کہ ان کے بزرگ واساتذہ بھی ان کو اس طرز سے نہیں روکتے بلکہ ان کے سرمایۂ تقریر میں اس کو معین اور قوت پیدا کرنے والا سمجھا جاتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ علم کی تو کمی ہوگئی ہے اس لئے تلمیع (ظاہری ملمع سازی آب تاب تصنع وتکلف) کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ کھری چیز پاس میں نہیں ہے اور جس کے پاس کھری چیز ہوگی اس کو ملمع کی ضرورت کیوں ہوگی۔ پس اس کی غیر ملمع تقریر گو لفظی آب وتاب نہ رکھے مگر اس میں حسن باطنی ہوتا ہے اور ملمع تقریر میں گو آب وتاب ظاہری ہوتا ہے مگر

غور وفکر کے بعد وہ تمام رنگ اتر کر الفاظ ہی الفاظ رہ جاتے ہیں غرض جن کے پاس علمی سرمایہ ہے ان کو کسی قسم کی تلمیع کی ضرورت نہیں اور جن کے پاس یہ نہیں وہ ہر طرح تلمیع سے کام لیتے ہیں اور پھر بھی وہ حسن پیدا نہیں ہوتا۔
(دعوات عبدیت ص۱۱۵، ص۱۱۶ ج ۱۲)

ایسے لوگوں سے بڑا ضرر (نقصان) پہنچتا ہے جن کی زرق برق تقریریں مہذب الفاظ، شستہ بندشیں، مسلسل بیان معلوم ہوتا ہے کہ غزالی وقت خطبہ دے رہے ہیں، یا رازی زماں بول رہے ہیں مگر علم دیکھئے تو ہدایۃ النحو بھی شاید نہ پڑھی ہو۔ یہ لوگ جنہوں نے مسلمانوں کو تباہ کیا۔ خود ڈوبے اور دوسروں کو لے ڈوبے۔ (دعوات عبدیت ص۵۰ ج)

جن لوگوں کو آپ عالم کہتے ہیں یہ واعظ ہیں جنہوں نے چند عربی فارسی کے رسالے یاد کر لیے ہیں۔ ان کو علم کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ یہ لوگ اپنے کو علماء کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں اور جہل کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک واعظ صاحب نے سورۂ کوثر کا وعظ کہا اور پہلی آیت کا ترجمہ یہ کیا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے تجھ کو کوثر کے مثل دیا۔ اس احمق سے کوئی پوچھے کہ کاف تو اعطینا کا مفعول ہے پھر مثل کس لفظ کا ترجمہ ہے۔ (حقوق الزوجین ص۲۲۴)

وعظ تقریر میں کیا چیز زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔

نِرے زبان سے کچھ نہیں ہوتا جب تک کہ قلب کے اندر کوئی بات پیدا نہ ہو اور دل میں پیدا نہیں ہوتی جب تک کہ صحبت نہ ہو اس لیے صحبت کی بڑی ضرورت ہے خواہ کتابیں تھوڑی ہی پڑھائی جائیں مگر صحبت (صالح) زیادہ ہو۔ (حقوق زوجین ص۲۲۴)

مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کتاب دیکھ کر وعظ فرمایا کرتے تھے مگر مجمع پر حیرت انگیز اثر ہوتا تھا۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا جب میں کوئی بات کہتا ہوں تو میری دلی تمنا یہ ہوتی ہے کہ سب کے سب اس کے مطابق کام کرنے لگیں یہ بالکل صحیح ہے۔

وعظ نصیحت کے مؤثر ہونے میں واعظ و ناصح کا خیر خواہ اور دل سے اصلاح کا طالب ہونا سب سے زیادہ اہم شرط ہے۔ (مجالس حکیم الامت ص ۱۴۳)

ایک حکایت

اھل اللہ کی تقریر میں بھی ایک نور ہوتا ہے جو غیر اللہ کے کلام میں نہیں ہوتا۔ ایک بزرگ کے صاحبزادے تحصیل علم کے لئے کہیں باہر گئے۔ جب وہ فارغ ہو کر واپس ہوئے اور پورے عالم ہو گئے تو اپنے والد صاحب کے پاس آئے انہوں نے ان سے فرمایا کہ تم وعظ کہو۔ چنانچہ صاحبزادے نے وعظ کہا اور بڑے بڑے عالی مضامین بیان کیے مگر کسی پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ جب وعظ کہہ چکے تو ان کے والد صاحب منبر پر تشریف لائے اور وعظ سے پہلے انہوں نے اپنا واقعہ اسی رات کا بیان فرمایا کہ رات کو ہم نے روزہ کی نیت کی تھی سحری کے لئے کچھ دودھ رکھ دیا تھا مگر بلی آئی اور سارا دودھ پی گئی بس اتنا ہی بیان فرمایا تھا کہ ساری مجلس تڑپنے لگی۔ اس کے بعد ان بزرگ نے اپنے صاحبزادے سے فرمایا کہ صاحبزادے سننے والے پر قلب کا اثر پڑا کرتا ہے۔ الفاظ کا اثر نہیں ہوتا۔ تم نے اب تک علم الفاظ حاصل کیا ہے اب قلب کے اندر بھی اس علم کو پہنچانا چاہیئے۔

اہل اللہ کے کلام میں یہ ضروری نہیں کہ آنکھوں سے آنسو نکلنے لگیں بلکہ اہل دل کے کلام سے سامعین کے دل آنسوؤں سے بھر جاتے ہیں۔ (حقوق الزوجین ص ۱۲۱)

IMP

بے عمل واعظ مقرر کی تقریر غیر مؤثر ہوتی ہے۔

مُشاہدہ ہے کہ اگر ناصح خود عمل نہ کرے تو اس کی نصیحت میں اثر نہیں ہوتا جو خود عمل کرتا ہے اس کی نصیحت میں اثر ہوتا ہے۔ فی نفسہ تاثیر کے علاوہ اس کا ایک طبعی سبب بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر خود ناصح کا اس پر عمل نہ ہو تو مخاطب کو یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ عمل ضروری ہوتا تو یہ ناصح خود کیوں نہیں کرتا معلوم ہوتا ہے کہ غیر ضروری ہے۔

ایک جگہ میں گیا وہاں اسکول بھی تھا جس میں مسلمانوں کے بچے پڑھتے تھے اور ماسٹر ان کا ہندو تھا۔ وہاں لوگوں نے مجھ سے ماسٹر کی بڑی تعریف کی کہ یہ روزانہ پانچ وقت کی نماز پڑھوانے کے لئے لڑکوں کو مسجد لے جاتا ہے میں نے کہا ان کا پڑھوانا کچھ مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ روزانہ پانچ وقت بچوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر نماز کوئی ضروری چیز ہے تو ماسٹر صاحب خود کیوں نہیں پڑھتے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ نماز پڑھوانے والا مسلمان ہونا چاہیئے اور حقیقت میں یہی ہوتا ہے کہ باعمل علمار کا جو اثر ہوتا ہے وہ بے عمل علمار کا نہیں ہوتا۔

میں نے خود ایک مقام پر ایک واعظ صاحب کو دیکھا میں بھی اس میں بلایا گیا تھا۔ واعظ صاحب بھی تشریف لائے اس شان سے کہ سیکنڈ میں سفر کیا اور اپنے ساتھ دس پندرہ مصاحبوں کو بھی لائے۔ بیچارہ سیکرٹری کہتا تھا کہ انہوں نے کورٹ کروا دیا۔ بارش کا موسم تھا۔ میں برآمدہ میں لیٹ گیا مگر آپ اندر لیٹے رہے۔ گرمی تھی تو سیکرٹری سے کہا کہ دو آدمی رات بھر پنکھا جھلنے کے لیے متعین کر دو سیکرٹری کو یہ بھی کرنا پڑا۔ صبح کو پانی برس رہا تھا۔ مسجد جانا مشکل تھا میں نے اٹھ کر نماز پڑھ لی مگر وہ حضرت اندر پڑے سوتے رہے اور صبح کی

نماز اڑا دی۔ اب جن کو انہوں نے وعظ سنایا ہوگا بھلا ان پر کیا اثر ہوا ہوگا
(التبلیغ ص۴۲۔۴۳ ج ۲۰)

وعظ تقریر میں تصنع وتکلف اور نامانوس الفاظ سے احتراز

بعض لوگوں کو اجنبی الفاظ برتنے کا شوق ہوتا ہے۔ سمجھتے ہیں کہ تبحر (علامہ) ہونے کی دلیل ہے۔ مانوس الفاظ برتنے چاہئیں۔ (حسن العزیز ص۲۵۰ ج ۲)

مولانا یعقوب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ دو باتیں مجھے بہت ناپسند ہیں ایک تو تقریر میں لغت بولنا دوسرے تحریر میں شکستہ لکھنا۔ تقریر سے مقصود افہام ہوتا ہے اور یہاں ابہام ہو جاتا ہے۔ (حسن العزیز ص۲۵۲ ج ۲)

اہل حق کی تقریر اور لیکچر اور جدید انداز کی تقریروں کا فرق۔

وہ انسپکٹر صاحب کہتے تھے کہ میں ان کی تقریریں سن کر سمجھا کرتا تھا کہ ان کے برابر کوئی محقق نہیں لیکن میں نے جب اہل حق کی تقاریر سنیں جن کو نہ لیکچر دینا آتا ہے اور نہ وہ بڑے بڑے الفاظ بولتے ہیں اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اصل علم کیا چیز ہے۔

اور کہتے تھے کہ غور کرکے اہل حق کی اور جدید طرز کے لوگوں کی تقریریں جو فرق میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جدید طرز کی تقریریں پہلی نظر میں تو نہایت دقیق اور موثر ہوتی ہے اور حق انہی میں منحصر معلوم ہوتا ہے لیکن جب ان میں غور کیا جائے تو ان کی حقیقت کھلتی جاتی ہے اور ان کا لچر اور کمزور

(۱۱۳)

اور خلاف واقع ہونا اور پر تلبیح (ظاہری ملمع سازی) ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔
اور اہل حق کی تقریریں اول نظر میں بے رنگ اور پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جتنا ان میں غور کیا جائے تو ان کی قوت اور واقع کے مطابق ہونا معلوم ہوتا جاتا ہے اور قلب پر ان کا نہایت گہرا اثر ہوتا ہے کہ اس کے سامنے تمام تلبیحات قلب سے دھل جاتی ہیں۔ (دعوات عبدیت ص ۱۱۷ ج ۱۱)
محقق کی ایک منٹ کی تقریر میں جو اثر ہوتا ہے وہ غیر محقق کے آدھ گھنٹے کے لیکچر میں بھی نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو دیکھی ہوئی کہہ رہا ہے اور یہ یونہی (الفاظ) ہانک رہا ہے۔ (حسن العزیز ص ۴۵۹ ج ۱)

جدت پسندی اور لیکچرار کا طرز اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔

ہم تو صاف کہتے ہیں کہ ہمیں لیکچروں کا طرز سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں اور جو شخص لیکچر کے طرز کو سیکھتا ہے وہ اول ہمارے دل میں ناپسندیدگی کے بیج بوتا ہے۔ ہم کو تو وہی طرز پسند ہے جس کی طرف حدیث شریف میں اشارہ ہے کہ نحن امة امية (ہم امی قوم ہیں) امیة کے معنی سادگی کے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی مرضی یہ ہے کہ آپ کی امت نہایت سادہ رہے اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ نحن فرما کر ساری امت کو شامل فرمالیا۔ اتباع نبوی کی روح یہی ہے کہ ہر ہر بات میں سادگی ہو۔
امیة ام کی طرف منسوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی ایسی رہی جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد بچہ کی زندگی ہوتی ہے کہ اس

کی حرکت تصنع اور بناوٹ کی نہیں ہوتی بلکہ ہر حرکت میں سادگی ہوتی ہے
اور بچوں کی یہی صفت ہے۔ جس کی وجہ سے ہر شخص کو ان سے محبت ہوتی
ہے ورنہ طبعاً بچوں سے جو کہ نجاست کی پوٹ ہوتے ہیں بہت نفرت ہونی
چاہیئے تھی۔

تو امیت کا اصلی مفہوم یہی بے ساختگی ہے اور نہ لکھنا پڑھنا جو امیت کا مشہور مفہوم ہے۔ یہ بھی اسی کا ایک شعبہ ہے تو بیان میں بھی بناوٹ اور تکلف بالکل نہیں ہونا چاہیئے اور تلبیس اور تلمیع (ملمع سازی) سے بالکل پاک ہونا چاہیئے۔ البتہ بیان میں سادگی کے ساتھ صفائی ہونی ضروری ہے لیکن اب یہ طرز بالکل چھوٹتا جارہا ہے۔ ہم اہل علم کو دیکھتے ہیں کہ نو رواج (جدید) زبان کا طرز آتا جارہا ہے اور ستم یہ ہے کہ ان کے بزرگ و اساتذہ بھی ان کو اس طرز سے نہیں روکتے۔ (دعوات عبدیت ص۱۱۸)

فصل:..... محقق اور حق پرست واعظ کی پہچان

آج کل واعظ دو قسم کے ہیں۔ ایک تو پیشہ ور واعظ ان کا مقصود تو یہ ہوتا ہے کہ مضمون ایسا ہو جس سے مجلس پر رنگ جم جائے چاہے ان کی ضروریات کا ہو یا نہ ہو۔ اسی لیے وہ نئے نئے مضامین کا اہتمام کرتے ہیں اور پرانا مضمون بھی بیان کریں گے تو اس میں ضرورت کا لحاظ نہ کریں گے بلکہ وہ مضمون اختیار کریں گے جس سے مجلس گرم ہو جائے چنانچہ اسی لیے بعض لوگ ہر جگہ شہادت نامہ کو لے کر دوڑتے ہیں کیونکہ وہ واقعہ ہی ایسا سنگین ہے کہ سنگدل سے سنگدل بھی اس سے موم ہو جاتا ہے مگر جو محقق (علماء) اور (واعظین) ہیں وہ اس پر نظر نہیں کرتے بلکہ وہ ہمیشہ ضرورت کا لحاظ کرتے ہیں (حاصل کلام یہ کہ) یہ نہ دیکھنا

چاہیئے کہ مضمون نیا ہے یا نہیں ہاں یہ دیکھنا چاہیئے کہ ضرورت کے موافق بھی ہے یا نہیں کیونکہ مضمون کا نیا ہونا کچھ خوبی کی بات نہیں۔ یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی طبیب ایک نسخہ لکھے اور دعویٰ کرے کہ یہ نسخہ ایسا ہے کہ نہ کسی کتاب میں لکھا ہے نہ کسی طبیب نے تجویز کیا ہے تو اس کو کوئی قبول نہ کرے گا بلکہ یہ کہا جائے گا کہ نسخہ کی خوبی تو یہ ہے کہ حکماء سلف کے اصول کے مطابق ہو اور اس کے اجزاء کی ترتیب کسی طبیب حاذق کے رائے سے ہوئی ہو ورنہ گھڑت ہو گی اسی کو شریعت میں بدعت کہتے ہیں پس جس طرح نسخہ میں نیا ہونا مطلوب نہیں بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ مزاج کے موافق ہو اور اصول و قواعد کے مطابق ہو۔ اسی طرح وعظ میں بھی یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ مضمون پرانا ہے یا نیا بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ ضرورت اور مخاطبین کے حالات کے مناسب ہے یا نہیں محقق ہمیشہ ضرورت کا لحاظ کر کے وقت اور موقع کے موافق مضمون بیان کرتا ہے چاہے وہ مکرر اور پرانا ہی کیوں نہ ہو۔ ——— (صفحہ ۱۰۷)

کیونکہ وعظ روحانی علاج ہے اور علاج میں ہمیشہ مریض کی حالت کا لحاظ کیا جاتا ہے اگر ایک شخص کو بخار ہے تو وہ دس دفعہ بھی حکیم کے پاس جائے گا تو وہ بخار ہی کا نسخہ لکھے گا یہ نہیں کہ آج بخار کا لکھے اور کل کو زکام کھانسی اور پرسوں کو کسی اور مرض کا تاکہ نسخہ مکرر نہ ہو۔ وہ اس کی کبھی رعایت نہ کرے گا بلکہ جب تک بخار ہے بخار ہی کا نسخہ دے گا پس لوگوں کو چاہیئے کہ وہ یہ نہ دیکھیں کہ مضمون پرانا ہے یا نیا طالب علاج کو اس سے کیا بحث۔

(آداب التبلیغ وعظ اصلاح ذات البین ص ۲۴۹، ص ۲۵۲)

تقریر اور اردو زبان میں انگریزی ہندی الفاظ استعمال کرنے سے احتراز۔

قطع نظر شریعت کے یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ہماری زبان اردو ہے اور اس

کی کچھ خصوصیات ہیں جیسا کہ ہر زبان کے لیے کچھ خصوصیات ہوا کرتی ہیں۔ اب اس طرز جدید کو اختیار کر کے انگریزی کی خصوصیات کو اردو زبان سے میں لے لیا گیا ہے اور وہ روز بروز زیادتی کے ساتھ آتی جاتی ہیں حالانکہ انگریزی کی خصوصیات اس میں بالکل نہیں کھپتیں۔ ان کی بدولت زبان نے بالکل بھدی اور خراب ہوتی جاتی ہے۔

ایسے لوگوں میں اس وقت ایک بڑی جماعت اپنے کو اردو کا حامی کہتی ہے حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ لوگ اردو کے ماحی (مٹانے والے) ہیں کیوں کہ ہر زبان میں ایک مادہ ہوتا ہے۔ اور ایک ہیئت (صورت) اور زبان ان دونوں کے مجموعے کا نام ہوتا ہے۔ نہ کہ صرف مادہ کا۔ تو جب اردو زبان کی ہیئت باقی نہ رہے گی تو وہ زبان اردو کیوں کر رہے گی۔ اگر ہم اردو کے حامی ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ ہم اس کی خصوصیات کو باقی رکھیں اور ہماری گفتگو ایسی ہو کہ اگر اجنبی سنے تو یہ سمجھے کہ ہم ایک حرف بھی انگریزی کا نہیں جانتے اور نہ انگریزی طرز سے ہم کو مناسبت ہے۔

بڑا تعجب یہ ہے کہ اس وقت عربی خواں طلبہ کی تقریروں میں کثرت سے انگریزی الفاظ آنے لگے ہیں۔ حالانکہ ان کی تقریر میں اگر دوسری زبان کے الفاظ آتے تو عربی کے الفاظ آتے کیوں کہ اول تو یہ لوگ عربی زبان کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے عربی زبان ہماری مذہبی زبان ہے اور اس اعتبار سے اصلی زبان وہی ہے۔ جب ہماری اصلی زبان عربی ہے تو اگر ہم کو اردو میں آمیزش ہی کرنا تھا تو زیادہ سے زیادہ ہم یہ کرتے کہ اردو زبان کو عربی کے تابع کر دیتے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ ہم نے انگریزی کے تابع کیا جس کی بدولت اردو زبان قریب قریب اردو ہونے ہی سے نکل گئی۔ اگر اردو میں آمیزش کرنا ہو تو عربی کی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ عربی کی آمیزش لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔ دیکھو فارسی کی عبارت

میں اگر عربی کا کہیں ایک جملہ آجاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گلفشانی ہو گئی ہو۔ خلاصہ یہ کہ ہماری زبان میں انگریزی کے الفاظ ملانے) سے ایک جدت پیدا ہو گئی ہے وہ ضرور قابل ترک ہے اور اس جدید طرز میں مذکورہ نقص کے علاوہ ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ تلبیس زیادہ ہو سکتی ہے اور پرانے طرز میں یہ بات نہیں ہے۔ (دعوات عبدیت ص۱۲۱ ج۲)

شرعی پہلو

اور ایک شرعی پہلو اس میں یہ بھی ہے کہ اس کو اختیار کرنا ایک فاسق قوم کے مشابہ ہونا ہے اور یہ مشابہت خود حرام ہے۔ حدیث شریف میں ہے من تشبہ بقوم فھو منھم۔ (جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہیں میں سے ہے) تشبہ عام ہے لباس اور طرز سب چیزوں کو۔ حدیث آپ پر بھی حجت ہے کیونکہ مسلمان تو آپ بھی ہیں۔

غرض اس وقت تقریروں میں یہ تمام خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جن سے قواعد شرعیہ کے چھوڑ دینے کے سبب سے ان تقریروں کا وجود کالعدم سمجھا جائے گا۔ (دعوات عبدیت ص۱۲۲ ج۲)

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیہاتی لوگ عشاء کی نماز کے نام میں تم پر غالب نہ آجائیں کیونکہ کتاب اللہ میں (اس کا نام) عشاء ہے (اور وہ اس کو عتمہ کہتے تھے۔ (مسلم شریف)

ف:۔ اس سے معلوم ہوا کہ بول چال میں بھی بلا ضرورت ان لوگوں کی مشابہت نہ ہونا چاہیئے۔ جو دین سے واقف نہیں۔ (حیوۃ المسلمین ص۲۲۷)

شرعی اور عربی اصطلاحات کے استعمال کی اہمیت

لوگ الفاظ کو معمولی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ الفاظ بڑی چیز ہیں۔ الفاظ ہی سے آدمی مسلمان سمجھا جاتا ہے اور الفاظ ہی سے کافر ہو جاتا ہے۔ شریعت میں الفاظ کا اس درجہ اہتمام ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں (لا یغلبنکم الاعراب علی اسم العشاء الآخرۃ وکانوا یسمونہا العتمہ او کما قال) مطلب یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عشاء کے وقت کو عتمہ کہا کرتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جہلاء عرب اس لفظ میں تم پر غلبہ نہ کر پائیں۔ کہ تم بھی ان کی طرح عشاء کو عتمہ کہنے لگو۔

اس میں اس بات کی تعلیم ہے کہ شریعت نے جن الفاظ میں اپنی کوئی خاص اصطلاح مقرر کی ہے مسلمانوں کو اسی کا استعمال کرنا چاہیئے۔ اس کو چھوڑ کر کفار کی اصطلاح نہ برتنی چاہیئے۔ ظاہر میں تو یہ معمولی بات ہے کہ بول چال میں اپنے اسلامی الفاظ بولے جائیں مگر اس کے چھوڑنے میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر اس کی قدر معلوم ہوتی ہے کہ اگر سب مسلمان الفاظ کو معمولی سمجھ کر دوسری زبان کے مہینے استعمال کرنے لگیں تو رمضان اور عید اور حج وغیرہ کا کسی کو پتہ بھی نہ چلے کہ یہ کب آئے تھے اور کب چلے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ کی رعایت فرما کر محض الفاظ کو نہیں بلکہ دین کو سنبھالا ہے مگر آج کل لوگ ان کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ (التبلیغ اسباب الفتنہ ص۳ ج ۱۰)

باب ۷

ہماری اصلی اور پدری زبان عربی ہے اور مادری زبان اُردو ہے ..... "ہندوستان میں اُردو کیسے آگئی"

عربی ہماری مذہبی زبان ہے اور اس اعتبار سے اصلی زبان وہی ہے اور اردو تو بہت تھوڑے دنوں سے ہماری زبان ہوئی ہے ورنہ ہماری اصلی اور پدری زبان عربی ہی ہے. کیونکہ ہمارے آباء و اجداد عرب ہی سے آئے ہیں اور ہندوستان میں بود و باش اختیار کرلی ہے۔ ہندوستان میں ہمارے بزرگ اکثر جزیرۂ عرب سے تشریف لائے ہیں اور یہیں بود و باش اختیار کرکے یہیں کی نومسلم عورتوں سے نکاح کیے ہیں اس لیے اولاد پر زیادہ اثر ماں ہی کی زبان کا پڑا۔ اور اسی سے یہ نئی زبان پیدا ہوگئی۔ اسی مادری اثر کی بدولت ہندوستان میں عربی بھی نہ چل سکی۔ کیونکہ ابا جان تو عربی بولتے ہوں گے اور اماں جان ہندی۔ اور بچہ زیادہ تر ماں ہی کے پاس رہتا ہے اس لیے کچھ ہندی اور کچھ عربی مل کر ایک مجموعہ ہوگیا اور اگر گھر میں عربی ہوتی اور باہر لوگوں سے ہندی سنتے تو دونوں زبانیں باقی رہتیں چنانچہ ہم بنگالیوں اور انگریزوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی زبان بھی بولتے ہیں اور اردو بھی بولتے ہیں وجہ یہی ہے کہ ان کے گھروں میں دیسی بنگلہ اور انگریزی بولی جاتی ہے ہمارے بزرگوں نے چونکہ اس کا اہتمام نہیں کیا یا نہ ہوسکا اس لیے ہماری زبان مرکب ہوگئی۔

غرض ماں کی ہندیت نے زبان کی عربیت کو ضائع کیا اور اصلی زبان برباد ہوگئی اور کوئی کہے کہ ہم تو مادری زبان کو اصل سمجھتے ہیں تو میں کہوں گا کہ جب حسب نسب باپ سے ہے تو کیوں باپ کی زبان کو اپنی اصلی زبان نہ کہا جائے۔ ہماری اصلی زبان عربی ہے ۔
(دعوات عبدیت صفحہ ۱۲۱ ج ۱۲ تعلیم البیان)

اُردو زبان کی فضیلت

جس طرح فارسی زبان کے لئے عربی زبان کے ساتھ مناسبت ہونے کی وجہ سے فضیلت حاصل ہے اور چونکہ اس فضیلت کا اثر احکام دینیہ میں بھی ظاہر ہو چکا ہے اس لیے وہ فضیلت دینیہ ہے۔ اسی طرح بلاشبہ اردو کو بھی عربی اور فارسی کے ساتھ قوی مناسبت ہونے سے فضیلت دینیہ حاصل ہے بلکہ فارسی کو تو عربی سے صرف مشابہت ہی کی مناسبت ہے اور اردو کو فارسی اور عربی سے جزئیت کی مناسبت ہے جیسا کہ ظاہر ہے کہ اردو میں کثرت سے فارسی اور عربی کے الفاظ مفردہ استعمال ہوتے ہیں بلکہ بہت سے جملے تو ایسے ہوتے ہیں کہ روابط کا، کی، اور سے، تے اور نہیں کے سوا پورا مادہ فارسی اور عربی ہی کا ہوتا ہے۔

دوسری فضیلت اس میں یہ ہے کہ علوم دینیہ کا اس زبان میں غیر محدود وغیر محصور ذخیرہ ہے جس کو علماء و مشائخ نے صدیوں کی مشقت اور اہتمام سے جمع فرمایا ہے۔ خدانخواستہ اگر یہ زبان ضائع ہوگئی تو یہ تمام ذخیرہ ضائع ہو جائے گا۔ بالخصوص عوام مسلمین کے لیے تو علم دین کا کوئی ذریعہ ہی نہ رہے گا کیونکہ ان کا استفادہ عربی نہ جاننے کی وجہ سے اسی (اردو) پر موقوف ہے۔ کیا کوئی مسلمان اس کو گوارہ کر سکتا ہے۔ ؟

تیسری فضیلت اس (اردو) کا سلیس اور آسان ہوتا ہے۔ اس تیسری (آسانی) کو آیات قرآنیہ میں موضع امتنان (احسان) میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ کما قال تعالیٰ فانما یسرناہ بلسانہ وقال تعالیٰ فانما یسرناہ بلسانک :۔ واشباھہما۔ (البدائع ص۱۵)

اُردو بھی خدا کی زبان ہے اس کو پڑھنے سے بھی ثواب ملے گا۔

لوگ عربی کو تو خدا کی زبان سمجھتے ہیں اور اردو فارسی بندوں کی زبان اور اس غلطی کا منشار زیادہ تر علماء کی کوتاہی ہے انہوں نے کبھی صاف صاف یہ نہیں کہا کہ اردو میں علم دین پڑھ لینے سے بھی وہ فضائل ہو سکتے ہیں۔ جو احادیث وقرآن میں علم کے لئے وارد ہیں حالانکہ قرآن وحدیث میں کہیں عربی کی تخصیص نہیں۔ (التبلیغ تعمیم التعلیم ص۱۴۶)

اردو کی شرعی حیثیت اردو کی حفاظت واجب ہے۔

اِس وقت اردو کی حفاظت دین کی حفاظت ہے۔ اس بنار پر یہ حفاظت حسب استطاعت طاعت اور واجب ہوگی اور باوجود قدرت کے اس میں غفلت اور سستی کرنا معصیت اور موجب مواخذہ آخرت ہوگا واللہ اعلم۔ (البدائع ص۱۵)

ضرورت کے وقت دوسری زبان اختیار کرنا۔

سوال :۔ آج کل آریہ مذہب والوں کا زور شور ہے۔ قرآن و حدیث پر طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو بہکاتے ہیں۔ علماء اگرچہ تحقیقی جوابات دیتے ہیں۔ لیکن اس زمانہ میں الزامی جواب زیادہ نافع اور مسکت اور باوقعت ہوتا ہے اور الزامی جواب ممکن نہیں تاوقتیکہ اُن کے مذہب سے پوری واقفیت نہ ہو اور اُن کے مذہب کی کتابیں وید وغیرہ سنسکرت زبان میں ہے۔ اس لیے اس ضرورت سے اگر سنسکرت زبان سیکھی جائے تو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ اس کی تعلیم و تعلّم کا فی نفسہ جائز ہونا تو مانع جواز کے نہ ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے اور قاعدہ مقررہ ہے کہ جو امر جائز کسی امر مستحسن یا واجب کا مقدمہ و موقوف علیہ ہو وہ بھی مستحسن یا واجب ہوتا ہے اور سوال میں ذکر کی ہوئی مصلحت کے استحسان یا ضرورت میں کوئی کلام و خفاء نہیں لہٰذا اس زبان کی تحصیل ایسی حالت میں بلاشبہ مستحسن یا ضروری علی الکفایۃ ہے اسی بناء پر ہمارے علماء متکلمین نے یونانی فلسفہ کو حاصل کیا اور علم کلام بطرز معقول مدوّن فرمایا۔

ویؤیدہ ما رواہ مسلم عن حذیفۃ رضی اللہ عنہ قال کان الناس یسألون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الخیر وکنت اسئلہ عن الشر مخافۃ ان یدرکنی قلت واداراک الشر للمسلمین کا دراکہ لنفسہ۔ ۔ (امداد الفتاویٰ ص۴۲ ج ۴)

—۞—

باب ۸

وعظ تقریر میں چندہ کی اپیل ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔

جو مولوی وعظ کہہ کر نذرانہ قبول کرتے ہیں یا چندہ وصول کرتے ہیں ان کے وعظ نصیحت کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔

چندہ کے متعلق بیان کرنے والے پہلے ہی سے یہ نہیں کہتے کہ آج چندہ کا بیان ہوگا بلکہ پہلے مذہب کے حقوق اور علم کے فضائل بیان کرتے ہیں پھر یہ کہتے ہیں حفاظت اسلام کی بہتر صورت مدارس وغیرہ کا قیام ہے پھر کہتے ہیں کہ ان کا قیام سب مسلمانوں کی توجہ و ہمت سے ہوسکتا ہے اب چندہ کی ترغیب دیتے ہیں۔

اس سے سننے والے کو دھوکہ ہوتا ہے کیونکہ وہ تو یہ سمجھ کر بیٹھتے ہیں کہ ہم سے کچھ نہ مانگا جائے گا اور جب اخیر میں ان سے چندہ کو کہا گیا تو بعض کو ناگوار ہوتا ہے اور وہ اپنے دل میں کہتے ہیں کہ ہم کو پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ اخیر میں ہم سے چندہ مانگا جائے گا تو ہم اتنی دیر تک اپنا وقت ضائع نہ کرتے۔

دوسرے اس طرح تمہیدی مضامین کی ساری وقعت سامعین کے دل سے نکل جاتی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بس یہ سارا زور شور اس لیے تھا کہ ہمیں چندہ دو۔ سو میں مسلمانوں کو دھوکا نہیں دینا چاہتا اور نہ احکام علوم شرعیہ کی وقعت کھونا چاہتا ہوں۔ (التبلیغ ص۱۷ ج۱۴)

—۔—

حضرت تھانویؒ کا معمول

میں ایسا نہیں کرتا اولاً تو میں چندہ کے متعلق بیان ہی نہیں کرتا اور اگر کبھی کرتا ہوں تو شروع ہی میں کہہ دیتا ہوں کہ آج چندہ کا بیان ہوگا جس کا جی چاہے بیٹھے اور جس کا جی نہ چاہے اٹھ کر چلا جائے۔ میں چندہ کے مضمون کو توطیہ و تمہید کے بعد اس لئے نہیں کہتا کہ اس سے سننے والوں کو دھوکہ ہوتا ہے جس مضمون کے متعلق مجھ کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس سے سامعین پر گرانی ہوگی میں پہلے ہی سے اس کو ظاہر کر دیتا ہوں اس کے بعد جو کوئی بیٹھے گا مطمئن ہو کر بیٹھے گا اور مجھ پر اس کے بیٹھنے کا کوئی احسان نہ ہوگا۔ اور نہ وہ میرے اجمال و ابہام کی وجہ سے بندھے گا میں ابہام کو پسند نہیں کرتا۔

(التبلیغ ص۱۳ ج ۱۴)

اصل مضمون سے پہلے تمہید بیان کرنا۔

میری عادت ہے کہ جس مضمون کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے میں اس کو پہلے ہی صاف کہہ دیتا ہوں۔ بخلاف عام مقرروں کے کہ ان میں بعض دفعہ بیان کرنے والا مقصود کو توطیہ و تمہید کے بعد ادا کرتا ہے۔ اور اس میں بھی ایک حکمت ہے وہ یہ کہ اس میں دیر تک سامعین کو مقصود کا اشتیاق رہتا ہے۔ اور اشتیاق کے بعد جو بات معلوم ہوتی ہے اس کی وقعت ہوتی ہے اور دوسرے یہ بھی حکمت ہے کہ اگر وہ مضمون ایسا ہو جس سے طبائع پر گرانی ہوتی ہو تو پہلے ہی سے اس مضمون کو سن کر لوگوں کو گرانی نہ ہو اور سامعین اٹھ اٹھ کر نہ چل دیں۔

اگر کسی کو تو طیہ و تمہید سے صرف مضمون کی وحشت دفع کرنا مقصود ہو اور کوئی نیت نہ ہو تو تمہید کے بعد مقصود بیان کرنے کا بھی مضائقہ نہیں کیونکہ سامع کی وحشت کو دفع کرنا بھی مطلوب ہے۔
مگر جہاں تک میں دیکھتا ہوں ان پیشہ والوں کی نیت تو طیہ و تمہید سے یہ نہیں ہوتی کہ سامعین کی وحشت مضمون سے دفع ہو بلکہ زیادہ تر اپنی مصلحت پیش نظر رکھتے ہیں کہ لوگوں کو ہم سے وحشت نہ ہو جائے اس لیے وہ چندہ کے مضمون کو ایسی رنگ آمیزی اور تمہید کے بعد زبان پر لاتے ہیں کہ لوگوں کو ان حضرت واعظ سے نفرت نہ ہو مگر میں اس کو خیانت سمجھتا ہوں

(التبلیغ ص۱۱ ج ۱۴ ص۱۲ خیر الارشاد)

واعظ کا نذرانہ لینا اور اس کی تنخواہ کا مسئلہ

عُلماء چونکہ قوم کی دینی خدمت میں محبوس ہیں اس لیے ان کی تنخواہ یا نذرانہ قوم کے ذمہ ہے۔ البتہ کسی خاص وعظ پر نذرانہ ٹھیرا کر لینا یہ ناجائز ہے باقی جو محبوس ہونے کے سبب تدریس یا تبلیغ پر تنخواہ لیں گے وہ جائز ہے وعظ کی نوکری بطور مشاہرہ کے جائز ہے۔

(التبلیغ ص۴۰ ج ۲ حقوق العلم ص۵۰)

وعظ کہہ کر نذرانہ لینے کی خرابی

وعظ کہہ کر نذرانہ لینے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس وعظ کا کسی پر اثر نہیں ہوتا۔ دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ واعظ اظہار حق سے مال فوت ہونے کے خوف سے رکتا ہے اور تنخواہ لے کر وعظ کہنا اس سے مستثنیٰ ہے۔ (ایضاً ص۹۳)

حسبۃً للہ کوئی وعظ کہے اور خوشی سے کچھ لوگ دیں اس کا لینا جائز ہے۔ جواز کے شرائط۔

[اسی طرح اگر محض حسبۃً للہ احکام کی اشاعت کرے اور متفرق طور پر لوگ کچھ خدمت کر دیں اور قلب میں کچھ طمع نہ ہو گو احتمال و وسوسہ ہو وہ بھی جائز ہے۔ اور اس کا امتحان کہ یہ کام حسبۃً للہ کیا جاتا ہے یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وعظ کہنے کے واسطے جانے کے لئے یہ شخص کن مقامات کو منتخب کرتا ہے، آیا ان مقامات کو جہاں روپیہ ملنے کی زیادہ امید ہو یا ان مقامات کو جہاں تبلیغ احکام کی زیادہ ضرورت ہو پہلی صورت میں جواز نہ ہوگا دوسری صورت میں ہوگا اور جواز میں جو یہ قید لگائی ہے کہ قلب میں کچھ طمع نہ ہو اس کی دلیل یہ حدیث ہے۔ فما جاءك من هٰذا المال وانت غير مشرف ولا سائل فخذ وما لا فلا تتبعه نفسك اور احتمال و وسوسہ طمع و اشراف میں فرق یہ ہے کہ اگر خیال ہوا کہ شاید کچھ ملے اور نہ ملنے سے اذیت نہ ہوئی تو صرف وسوسہ تھا اور اگر ایذا و رنج ہوا اور قلب میں شکایت و ناگواری ہوئی کہ ان لوگوں نے کچھ نہیں دیا تو طمع و اشراف تھا۔ (حقوق العلم ص۵۸)

بعض مبلغین کا قصور اور خیانت

ایک کوتاہی بعض مبلغین کی یہ ہے کہ وہ چندہ میں (اپنے اخراجات یعنی سفر خرچ وغیرہ میں) اسراف بہت کرتے ہیں۔

بے دریغ روپیہ اڑا ڈالتے ہیں مثلاً خود اپنے پیسے سے چاہے تھرڈ میں

بھی سفر نہ کریں (بلکہ بجائے ایکسپریس کے پسنجر سے کریں۔) اگر چندہ کا پیسہ ایسا مفت کا ہے کہ اب سیکنڈ کلاس (بلکہ فرسٹ کلاس) میں سفر کرتے ہیں۔ سیکنڈ سے کم میں نہیں بیٹھ سکتے جو کام خط سے نکل سکتا ہے اس کے لئے تار پر تار جا رہے ہیں۔ اسٹیشن پر برف لمیٹڈ بھی پی رہے ہیں۔ چائے بسکٹ بھی اڑا رہے ہیں۔ چاہے اپنے پاس سے ایک دفعہ بھی ایسے کاموں میں پیسہ خرچ نہ کرتے۔ مگر چندہ (اور حوام) کا پیسہ ایسی بیدردی سے تباہ کرتے ہیں۔ واللہ مولویوں کی نسبت ایسے واقعات سن کر بہت رنج ہوتا ہے۔ کہ یا اللہ ان پر علم کا کیسا الٹا اثر ہوا۔ علماء کو اس سے بہت ہی احتراز کرنا چاہیئے۔ (ضرورت تبلیغ ص ۳۲۲ ص ۳۲۱ (تحفہ دعوت و تبلیغ)

وعظ و تقریر پر اُجرت لینے کا مسئلہ۔

سوال :۔ امامت اور وعظ پر اُجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب :۔ استیجار علی الطاعات (یعنی عبادات پر اجرت لینا) جو ناجائز ہے۔ اس میں سے امامت مستثنیٰ ہے اور بعض (لوگوں) نے وعظ کو بھی مستثنیٰ کہا ہے اور بعض نے عدم جواز میں داخل کر رکھا ہے۔ تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اگر وعظ کی نوکری کرلی مثل امامت کے تو اُجرت لینا جائز ہے اور اگر نوکری نہیں ہے عین وقت پر وعظ پر اُجرت کی شرط کرے تو جائز نہیں جیسے عین وقت پر امامت پر اُجرت مانگنے لگے (تو یہ ناجائز ہے)

(امداد الفتاویٰ۔ کتاب الاجارہ ص ۳۸۹ م

وعظ و تقریر کے بعد مٹھائی

فرمایا ہم تو وعظ میں بھی مٹھائی نہیں بانٹتے اس لیے کہ حرص ہی یہ

رسم بڑھ جائے گی پھر غربا کہیں گے کہ ہمارے پاس نہیں ہے ہم کیسے وعظ کہلائیں۔ بعض اہل حق پیر بھی بیعت کے وقت نذرانہ لے لیتے ہیں اور فی نفسہ اس میں کوئی خرابی بھی نہ تھی مگر مجھے تجربہ ہے اس میں یہ احتمال ہوا کہ یہ بھی ایک مفسدہ ہے یعنی لیتے دیتے دیکھ کر غرباء کی بیعت کی ہمت نہ ہوگی یا ان کو فکر کرنا پڑے گی۔ (حسن العزیز ص۳۰۱ ج ۲)

باب ۹ ...... اسلوب و انداز بیان

فصل ۱ ...... عنوان اور طرز تعبیر کا فرق

ہمیشہ نرم اور حکیمانہ اسلوب اختیار کرنا چاہیئے

فرمایا کہ عنوان کا بھی بڑا اثر ہوتا ہے۔ بات ایک ہی ہوتی ہے مگر تعبیر کا طریقہ جدا ہوتا ہے مثلاً مولانا شہیدؒ بی بی فاطمہ کے نام پر کونڈوں کو منع فرمایا کرتے تھے۔ شاہی خاندان کی ایک بڑی بی نے حضرت شہیدؒ کو بلایا اور کہا کہ بیٹا ہم نے سنا ہے کہ تم بی بی فاطمہ کے نام کے کونڈوں سے کو منع کرتے ہو۔ حضرت نے فرمایا کہ میری کیا مجال ہے کہ حضرت بی بی کے کونڈوں کو منع کردوں۔ میں نے منع نہیں کیا۔ کسی نے آپ سے غلط کہا۔ بلکہ بی بی فاطمہ کے ابا جان (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) منع کرتے ہیں۔ (افاضات الیومیہ ص۲۰۹ ج ۷)

عوام کو سمجھانے کا انداز۔ عوام کو تشویش میں ڈالنے سے احتیاط۔

ھمارے اکابر کا یہ طرز تھا کہ عوام کو تشویش میں نہ ڈالا جائے۔ کانپور میں ایک واعظ صاحب نے بیان میں فرمایا کہ بڑے پیر صاحب یعنی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا جنتی ہونا قطعی نہیں لوگ اس سے بھڑک گئے اور مقدمہ میرے پاس آیا۔ ہر فریق یہ خیال کرتا تھا کہ تائید میری کرے گا۔ میں نے پہلے اس عامی سے دریافت کیا کہ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو۔ اس نے کہا میں ان کو یقینی جنتی کہتا ہوں۔ میں نے کہا بہت ٹھیک ہے جب وہی جنتی نہ ہوں گے تو پھر کون ہوگا پھر میں نے اس سے کہا کہ تمہارے پاس اس کی کیا دلیل ہے۔ اس نے کہا کہ بڑے بڑے عالم اور بزرگ ایسا کہتے ہیں میں نے کہا اچھا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی تمہارے نزدیک جنتی ہیں۔ کہا ہاں۔ میں نے کہا اس کا کیا ثبوت ہے۔ کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں نے کہا بالکل درست ہے اب یہ بتلاؤ کہ حضور کے قول اور بزرگوں کے قول میں کچھ فرق ہے یا نہیں کہا ہاں ہے۔ میں نے کہا جیسا حضور کے اور بزرگوں کے ارشاد میں فرق ہے ویسا ہی حضرت صدیق کے اور بڑے پیر صاحب کے جنتی ہونے میں بھی فرق ہے یا نہیں کہا ہاں میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ وہ بھی تو یہی کہتا ہے جو تم کہتے ہو۔ یعنے غیر منصوص کا جنتی ہونا یقینی نہیں ظنی ہے مگر یہ غلبہ حسن کا ظن نہیں جانتا اس ظن کو اپنی اصطلاح میں یقین کہتا ہے ورنہ اس کے دل میں بھی دونوں نجاتوں میں وہی فرق ہے جو تم کہتے ہو کہ ایک یقینی اور ایک ظنی ہے

(کلمۃ الحق ص ۱۱۷)

جو آپ کا عقیدہ ہے اس کا بھی وہی عقیدہ ہے صرف عنوان کا فرق ہے۔ یہ اس کو یقینی کہتا ہے آپ غلبہ ظن کہتے ہیں باقی اصل معنی میں دونوں متفق ہیں۔

اس حکایت سے مقصود یہ ہے کہ بلاضرورت عوام الناس کو متوحش بنانا اور بلا دلیل ان پر بدگمانی کرنا اچھا نہیں ہے۔ (دعوات عبدیت ص۲۱ ج۲)

ایک اور مثال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر کے متعلق مولانا شہیدؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کا جواب

ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ایک صاحب کے پاس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نامزد حضور کی تصویر ہے اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیئے؟

فرمایا کہ حضرت مولانا شہیدؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کے زمانے میں بھی ایسی بات پیش آئی تھی۔ ایک شخص نے آکر حضرت شہیدؒ سے سوال کیا کہ میرے پاس ایک تصویر ہے۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نامزد ہے میں اس کے ساتھ کیا برتاؤ کروں؟ فرمایا کہ معاملہ کیا ہوتا حضور کے نامزد ہونے سے حکم شرعی نہیں بدلتا۔

پھر یہ شخص حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے پاس پہنچا۔ اور یہی عرض کیا حضرت شاہ صاحب نے دریافت فرمایا کہ جاندار ہے یا بے جان۔ عرض کیا کہ بے جان۔ فرمایا کہ جب صاحب تصویر (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) بے جان ہو گئے تھے تو کیا معاملہ کیا گیا تھا؟ عرض کیا کہ غسل وکفن دے کر دفن کیا گیا تھا فرمایا کہ تم بھی ایسا ہی کرو۔ کیوڑے اور گلاب سے غسل دو اور بہت قیمتی کپڑے

میں لپیٹ کر کسی ایسی جگہ دفن کردو جہاں کسی کا پاؤں نہ پڑے۔
بات ایک ہی ہے کہ (وہ تصویر) محو کردی گئی (یعنی ختم کر دی گئی) مگر عنوان کا فرق ہے۔ دوسرے طریقہ کا اختیار کرنا سہل ہوگیا پھر تدریجاً پہلا طریقہ گوارہ ہوگیا۔

حضرت تھانویؒ کا فیصلہ۔

پھر سائل نے عرض کیا کہ (فلاں صاحب) یہ کہتے تھے کہ اس کو لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور سپرد کرکے چلا آؤں گا۔ حضرت جو چاہیں اس کے ساتھ معاملہ کریں فرمایا اس میں میں کیا کروں گا جو شریعت کا حکم ہے وہی کروں گا۔
یہاں ایک طرف تو یہ ہے هذا تمثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ایک طرف تو ہے هذا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ دیکھ لو کون مقدم ہے۔
اور ایک اس سے بھی اچھا فیصلہ ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اگر یہ پیش کی جاتی تو حضور کیا معاملہ فرماتے۔ ظاہر ہے کہ اتنا بھی نہ فرماتے جتنا شاہ عبدالعزیزؒ صاحب نے فرمایا بلکہ مولانا شہیدؒ ہی جیسا فتویٰ اور عمل فرماتے۔
پھر فرمایا کہ حضرت مولانا شہیدؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی تجویزوں میں یہ فرق ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا نفع عام ہے اور حضرت شہیدؒ کا نفع تام ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نفع عام سے نفع تام افضل ہے گو نفع عام اسہل (زیادہ آسان) ہے دونوں حضرات کے مسلک کا یہ خلاصہ ہے جو میں سمجھتا ہوں۔

اور یہ حقیقت ہے کہ بزرگ باوجود مقصود میں متحد ہونے کے مختلف الطبائع ہوتے ہیں اس لیے نفس احکام میں تو نہیں مگر رائے (اور طریق کار) میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ (افاضات الیومیہ ص۲۴۲ ج ۲، ص۱۱۱ ہفتم ص۲)

حضرت تھانویؒ کا سمجھانے کا انداز

چنانچہ (وہ صاحب) شام کو مغرب کے بعد ایک بڑے مجمع کے ساتھ ملنے آئے اور ہاتھ میں پھولوں کا گجرا تھا۔ آتے ہی میرے گلے میں ڈال دیا۔ میں نے گردن سے نکال کر ہاتھ میں رکھ لیا۔ کہنے لگے باغ میں گیا تھا۔ وہاں بہت سے پھول ملے تھے جی میں آیا کہ اپنے پیاروں کو دوں۔ سو ایک تو شاہ عبدالقدوس صاحب کے مزار پر چڑھایا اور ایک تم کو دیا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ تم حضرت شیخ کو جنتی سمجھتے ہیں؟ کہا کیوں نہیں۔ میں نے کہا آپ جانتے ہیں کہ جنت کی روحیں کیسی ہیں اور ان پھولوں کی ان سے کیا نسبت ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ جیسے ایک شخص ایک سو پچیس تولہ کا عطر لگاتا ہو اور آپ اس کی ناک میں چار آنہ تولہ کا عطر ٹھونسنے لگیں تو کس قدر ناگوار ہوگا تو کیا ان پھولوں سے حضرت شیخ کو اذیت نہ ہوگی۔ انہوں نے فوراً توبہ کرلی، پھر عشاء کی نماز کے لئے مسجد میں گئے۔ وہاں علیحدہ بیٹھ کر ان سے کہا کہ آپ تو شاہ صاحب اور آپ تو حضرت حاجی صاحب کے ساتھ محبت کا دعویٰ کرتے ہو کیا حاجی صاحب کی ایسی صورت تھی پھر وہ داڑھی منڈانے سے بھی تائب ہوگئے۔ (ملفوظات ص۱۵۶)

حکمت عملی سے تردید کرنا۔ تردید کا عجیب غریب انداز

فرمایا مولانا غوث علی شاہ صاحب پانی پتی اپنے پیر کے ساتھ سفر میں تھے کہ ایک مقام پر گذر ہوا۔ وہاں ایک جاہل فقیر اپنے آپ کو خدا کہتا تھا۔ ان کے پیر نے کہا کہ ایسے شخص کی اصلاح ہم کیا کر سکتے ہیں مگر شاہ صاحب اس کے پاس گئے اور اس کی بہت تعظیم کی۔ اور کہا کہ ہم کو کیا معلوم تھا کہ آپ یہاں ہیں۔ ہم نے تو سنا تھا کہ آپ عرش پر ہیں (اگر معلوم ہوتا تو) بھلا وہاں کیوں کر تلاش کرتے پھر قرآن شریف کی کسی آیت کی تفسیر پوچھی اس نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا عجیب بات ہے قرآن تو آپ ہی نے نازل کیا۔ آپ ہی کی تصنیف ہے پھر اس کا کیا مطلب کہ آپ پڑھے ہوئے نہیں۔ پھر کہا میں کچھ نذرانہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بہت خوش ہوا۔ انہوں نے سوکھے ٹکڑے اس کے آگے رکھ دیئے۔ وہ فقیر غصہ ہونے لگا تو فرمایا اجی آپ ہی تو ہمارے رازق ہیں جو کچھ آپ نے ہمیں رزق دیا اسی میں سے ہم نے آپ کو دے دیا آپ خفا کیوں ہوتے ہیں الحاصل وہ بہت شرمندہ ہوا اور اسی بحث کے بعد اس نے توبہ کی۔

(فیوض الخالق ص۱۴۲)

تردید کا ایک اور عجیب غریب انداز۔ شاہ عبد العزیز صاحبؒ کا قصہ:

حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ کہیں چلے جا رہے

تھے راستہ میں ایک مجمع دیکھا معلوم ہوا کہ بیچ میں ایک ننگ دھڑنگ آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ کمبخت کفریات بک رہا ہے۔ نالائق اپنے عضو کو ہلا ہلا کر کہتا ہے کہ تو بہ تو بہ یہ تو اللہ کا الف ہے (نقل کفر کفر نباشد) اور بہت لوگ اس کے معتقد ہو رہے ہیں شاہ صاحب نے اپنے ایک ہمراہی شاگرد سے فرمایا کہ اس شخص کی کمر میں ایک لات مار دو اور یہ کہو کہ نامعقول بے پیرا معلوم ہوتا ہے بھلا کہیں الف کے نیچے دو نقطے بھی ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب جامع الفنون تھے۔ ننگوں کا جواب انہی کے مذاق کے مطابق دیا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور سارے معتقدین فنڈا ہو گئے (بھاگ کھڑے ہوئے) اس طرح فتنہ ختم ہوا اور یہ مذاق کچھ آج سے نہیں ہے پرانا مذاق ہے لوگ ہمیشہ سے ایسے شخص کے کم معتقد ہوتے ہیں جو آدمی کی شکل میں ہو عقل و تہذیب سے آراستہ ہو۔ (التبلیغ ص۱۹۶ ج ۱۷ ما علیہ البصر)

فصل ۲ مخالفین کی تردید کا طریقہ

قرآن مجید کا انداز

قرآن شریف کا بھی یہی طرز ہے کہ احکام بیان کر دیئے۔ مخالف پر زیادہ رد و قدح نہیں کیا۔ ایک مولوی صاحب نے عجیب بات کہی کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مناظرہ سے لوگوں کو کبھی نفع نہیں ہوا۔ تبلیغ سے ہوا ہے اور وہ بھی اس تبلیغ سے جو وجادلهم بالتی ھی احسن کے ماتحت ہو۔

قرآن مجید کا طرز دیکھو بہت دفعہ معجزات کا مطالبہ کیا گیا مگر معجزہ ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔ (افاضات الیومیہ ص۲۰۶ ج ۷)

انبیاء علیہم السلام کا طریقہ

بس کرنا یہ چاہیئے کہ جب اہل باطل اپنی (بکواس) بکیں تو اپنی (حق بات) الگ کہنے لگیں زیادہ اچھا طریقہ یہی ہے۔ انبیاء کا یہی طریقہ ہے کفار کے جواب میں اتنی مشغولی نہیں کرتے تھے البتہ حق کا اعادہ بار بار کرتے تھے جواب کے درپئے زیادہ نہیں ہوتے تھے اسی سے زیادہ نفع ہوا۔ ۱۴۱

مجھے طالب علمی کے زمانہ میں یہ تجربہ ہو گیا تھا اور بجائے مناظرہ کے میں یہ کرتا تھا کہ عیسائیوں وغیرہ کے مقابلہ میں اپنا وعظ دوسری طرف کھڑے ہو کر کہنے لگتا تھا اس سے بہت نفع ہوتا تھا۔ (کلمۃ الحق ص۹۹ حسن العزیز ص۴۹۱ ج۱)

حضرت تھانویؒ کا معمول

میں نے وعظ میں ان سب شبہات کے جواب دیئے پھر اعلان کیا کہ اگر کسی کو کوئی شبہ ہو تو دریافت کر لے بعد میں شکایت نہ کرنا کہ ہمارا شبہ حل نہ ہوا

غیر مسلموں سے مناظرہ زیادہ تر عوام کے لئے مضر ہے نافع طریقہ یہ ہے کہ بیان کیا جائے میں نے ایک وعظ میں بیان کیا ہے اس کا نام محاسن الاسلام رکھا ہے جو چھپ بھی گیا ہے دیکھنے کے قابل ہے۔ (کلمۃ الحق ص۹۵، ص۱۰۲)

اہل بدعت کی تردید کا طریقہ

لوگ خواہ مخواہ علماء سے جھگڑتے ہیں کہ فاتحہ اور مولود میں کیا خرابی ہے یہ تو اچھا کام ہے پھر اس سے کیوں منع کرتے ہیں۔ اس کا حقیقی

جواب تو یہ ہے کہ جن قیود کے ساتھ تم ان افعال میں ثواب کے قائل ہو شریعت نے ان قیود پر ثواب نہیں بیان کیا مگر عوام اس کو کیا سمجھیں۔

اسی لیے میں ان لوگوں سے الزامی گفتگو کیا کرتا ہوں۔ چنانچہ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ گاؤں میں جمعہ کیوں نہیں ہوتا۔ میں نے کہا آپ پہلے یہ بتلائیں کہ بمبئی میں حج کیوں نہیں ہوتا۔ بس خاموش ہو گئے۔

(۱۴۱) اسی طرح ایک گاؤں والے نے مجھ سے پوچھا کہ فاتحہ دینا کیسا ہے؟ میں نے کہا میاں تم نے لکڑیاں بھی کبھی اللہ واسطے دی ہیں؟ کہا جی ہاں! میں نے کہا تم نے کپڑا بھی کبھی دیا ہے؟ کہا ہاں! میں نے کہا پھر اس پر بھی فاتحہ پڑھی تھی؟ کہا نہیں! میں نے کہا پھر کھانے ہی پر فاتحہ کیوں پڑھتے ہو۔ تو وہ گاؤں والا کہنے لگا جی ہاں بس یہ تو فضول سی بات ہے۔ میں نے کہا ہاں خود سمجھ لو۔ اگر ثواب ہی پہنچانا ہے تو فاتحہ الگ پڑھ دو، کھانا الگ دے دو۔ دونوں میں جوڑ لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ گاؤں والے سمجھنے کے بعد حجتیں نہیں نکالتے کیونکہ ان کی طبیعت میں سلامتی ہوتی ہے ۱۴۲

اسی طرح ایک صاحب نے فاتحہ کے متعلق مجھ سے سوال کیا تو میں نے کہا کہ آپ پوری دیگ پر فاتحہ کیوں نہیں پڑھتے۔ پلاؤ کی دیگ میں صرف ایک طباق میں کھانا رکھ کر اسی پر کیوں پڑھتے ہو؟ کیا اللہ تعالیٰ کو نمونہ دکھلاتے ہو؟

اور ایک شخص کو میں نے یہ جواب دیا کہ بتلاؤ پکانے کا ثواب پہنچتا ہے یا کھلانے کا۔ کہا ثواب تو کھلانے کا ہوتا ہے۔

میں نے کہا پھر کھلانے کے بعد فاتحہ پڑھ دینا اور ثواب پہنچا دینا۔

یہ چند نمونے میں نے بتلائے ہیں کہ اہلِ بدعت کو الزامی جواب اس طرح دینا چاہیے کیونکہ وہ حقیقت کو سمجھنا نہیں چاہتے۔ ہاں اگر کوئی فہیم ہو تو اس کو حقیقت بھی بتلا دی جائے۔

(التبلیغ ص۴۹ ج ۱۷)

باطل فرقوں کی تردید کرنے کے متعلق نہایت ضروری مضمون۔

اہلِ باطل میں اس وقت دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جو ارتداد کی صورت میں مرتد بنا رہے ہیں اور ایک وہ جو اسلام کی شکل میں خود پہلے سے مرتد ہیں۔ اور دوسروں کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔ یہ فرقہ زیادہ مضر ہے یعنی اس وقت ایک فرقہ تو آریہ کا ہے وہ علانیہ کفر کی دعوت کرتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو اسلام کے پردہ میں کفر کو پھیلا رہے ہیں۔ وہ مرزائیوں کا گروہ ہے ان پر کفر و ارتداد کا فتویٰ ہو چکا ہے۔
مبلغین کو اس وقت ان دونوں کی مدافعت کرنا چاہیئے۔ جیسے آریہ ہیں ایسے ہی یہ نا آریہ بھی ہیں دونوں کافر ہیں۔
یہ میں نے اس لیے عرض کیا کہ کانپور میں میرا ایک وعظ ہوا تھا اس کا نام دعوت الی اللہ ہے وہ چھپ بھی گیا ہے۔ میں نے اس میں بیان کیا تھا کہ اب صرف آریہ کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اور آپس میں جو فرقے ہیں جیسے رضائی یا مرزائی ان سے نہ لڑنا چاہیئے یعنی جب وہ لوگ یعنی نو مسلم یا جاہل مسلمان ہمارے گھر کے اندر لڑائی دیکھیں گے تو متحیر رہ جائیں گے کہ یہ سب ہی مسلمان ہیں اور ایک دوسرے کو اہلِ باطل سمجھتے ہیں پھر ہم کدھر جائیں اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ اب مجھے تنبہ ہوا کہ یہ میرا خیال صحیح نہیں ہے پہلے مجھے واقعات معلوم نہ تھے میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ لوگ بھی صرف توحید و رسالت ہی کی اشاعت کرتے ہیں یعنی رسالت محمدیہ کی اب معلوم ہوا کہ وہ رسالت مرزائیہ کی اشاعت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ سنا تھا کہ وہ ان سے اُلجھتے ہیں تو اس وقت یہ رائے

دی تھی کہ آپس میں نہ لڑو اس سے جاہل مسلمان یا مرتدین پریشان ہوں گے اسلام سے رک جائیں گے پہلے ان کو کسی ہی ذریعہ سے مسلمان ہونے دو جب وہ مسلمان ہو جائیں گے پھر بتلا دینا کہ یہ مذہب باطل اور یہ حق ہے اور یہ بھی کہا تھا کہ یہ جب تک ہے کہ وہ مرزائی وغیرہ اپنے مذہب سے تعرض نہ کریں۔ نہ اپنے عقائد کی اشاعت کریں۔ اگر وہ اس سے تعرض کریں تو تم بھی دریغ نہ کرو۔

اب ایک دوست نے لکھا ہے کہ تمہارے وعظ میں جو یہ مضمون ہے اس سے تو لازم آتا ہے کہ ہم اور کفار ایک جگہ ہو کر اسلام کی اشاعت کریں اور اس خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ لوگ اپنے عقائد کی اشاعت سے تعرض بھی کرنے لگے ہیں تو میں نے جواب لکھا کہ اس میں اس حالت میں عدم سکوت کی طرف خود اشارہ ہے اور یہ اجازت دی کہ اب شائع کرو کہ اگر وہ اپنے مذہب سے تعرض کریں تو ہم بھی ان سے ضرور تعرض کریں گے۔

پھر ایک دوست نے مجھ کو یہ لکھا کہ اب وہ تعرض بھی نہ کریں جب بھی ہم کو تعرض کرنا چاہیئے کیونکہ حقیقت میں گو وہ مسلمان نہیں مگر ہمارے سکوت سے عام مسلمانوں کو یہ خیال ہوگا کہ یہ مسلمان ہیں تو پھر چندے وہ انہیں کو اپنا مقتدا اور پیر خیال کریں گے پھر ان سے لوگوں کو ہٹانا مشکل ہوگا۔

اس وقت میری آنکھیں کھل گئیں کہ بیشک میرا خیال غلط تھا پھر میں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا کہ ہمارے مبلغوں کو کیا کرنا چاہیئے ان سے تعرض کرنے میں ضرر یہ تھا کہ کہیں دعوت (تبلیغ) ہی نہ رک جائے اور بجائے مرتدین کو مسلمان بنانے کے کہیں مرزائیوں کے مناظرہ میں سارا وقت صرف نہ ہو جائے اور تعرض نہ کرنے میں یہ خیال ہوا کہ اگر لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دیا جائے کہ وہ جس کے ہاتھ پہ چاہیں اسلام لے آئیں چاہیں ہمارے ہاتھ پر یا مرزائیوں کے تو اسلام لانے کے بعد بعض نو مسلموں پر ان کا اثر ہو جائے گا پھر ہٹانا مشکل ہوگا۔ اس لیے مشورہ کیا گیا۔ غرض اس مصلحت کا بھی خیال تھا کہ اگر

اب نہ روکا جائے تو انجام میں اچھا اثر نہ ہوگا اور اس مفسدہ کا بھی خیال تھا کہ اس سے وہ نومسلم پریشان ہوں گے کہ ہم کدھر جائیں تو مشورہ میں بعض نے کہا کہ مقصود تو دعوت ہے تو مرزائیوں سے تعرض کرنا بھی تو دعوت ہے اس کو کیوں ترک کریں۔ مسلمان بنانا تو ہمارے ذمہ فرض نہیں۔ ہمارا کام دعوت دینا ہے خواہ اس تعرض کے بعد کوئی مسلمان ہو یا نہ ہو۔ اس کی پرواہ نہ کرنی چاہیے اور اب یہاں آکر بھی معلوم ہوا کہ راجح یہی ہے کہ ان کا رد ضرور کیا جائے اور نتیجہ پر نظر نہ کی جائے۔ اور اسی کو تو فرماتے ہیں۔ ان ربك هو اعلم بمن ضل عن سبيله وهو اعلم بالمهتدين اور وما كان لنفس ان تومن الا باذن الله۔

چنانچہ حضور کا بعض دفعہ جی چاہتا تھا کہ وہی معجزہ ظاہر ہو جائے جو کفار چاہتے ہیں تو اس کا کیا عجیب و غریب جواب ملا وان كان كبر عليك اعراضهم فان استطعت ان تبتغي نفقا في الارض او سلما في السماء فتاتيهم باية ولو شاء الله لجمعهم على الهدى فلا تكونن من الجاهلين۔ پوری آیت کا مطلب ظاہر ہے۔ (آداب التبلیغ ملحقہ دعوت و تبلیغ ص۱۲۵، ص۱۲۶)

جس مسئلہ کو بیان کرنے میں فساد کا اندیشہ ہو۔

فرمایا کہ بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ گو وہ فی نفسہ صحیح ہوں مگر مفضی ہو جاتے ہیں مفاسد کی طرف جہاں عوام کو ان کی اطلاع ہوئی اور آفتیں کھڑی ہوئیں ایسے مسائل نہیں بیان کرنے چاہیے میں نے بہت دفعہ بیان کیا ہے کہ علم دین بعض لوگوں کو مضر ہوتا ہے تو یہاں صرف ضرر علم سے بچانا مقصود ہے اس لیے کتمان بھی نہ ہوگا۔ (ملفوظات اشرفیہ ص۳۴۳)

فرمایا کہ جس مسئلہ پر زور دینے میں فتنہ کھڑا ہوتا ہو اس میں گفتگو بند کردی

جائے۔ کیونکہ اس خاص دینی مصلحت کی حمایت کرنے سے فتنہ کا دبانا ضروری ہے۔ ہاں مقتدائے اسلام کو شریعت کی ہر بات صاف صاف کہنا چاہیئے جیسے امام احمد بن حنبلؒ نے خلق قرآن کے متعلق صاف صاف کہہ دیا تھا اور جو ایسا بڑا مقتدا نہ ہو اس کی بحث کی ضرورت نہیں جہاں مخاطب سمجھدار منصف مزاج ہوں وہاں صحیح مسئلہ بیان کر دے اور جہاں بحث ومباحثہ کی صورت ہو تو خاموش رہے۔ (افاضات ص ۳۹ ج ۷ ص ۲)

جس وعظ سے فتنہ وفساد کا اندیشہ ہو اس کی مذمت

امر بالمعروف اور وعظ ونصیحت اگر وگر تبحر کے طور سے نہ کرو اس سے اور فتنہ وفساد ہوتا ہے۔ اور اگر تبحر کے طور سے نہ بھی ہو تب بھی جہاں فتنہ وفساد کا اندیشہ ہو وہاں کچھ مت کہو۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ نے وعظ کہنا چھوڑ دیا تھا بعض پیرزادوں نے اعتراض کیا۔ ایک پیرزادہ نے کہا کہ وعظ کہنا نہیں چھوڑ دیا بلکہ تم کو کافر ہونے سے بچا لیا کیونکہ وہ وعظ کہتے تو تم اسے رد کرتے اور وعظ میں شرعی احکام ہوتے ہیں تو تم شریعت کا رد کرتے اور رد شریعت کفر ہے۔ واقعی موقع ومصلحت کا سمجھنا حکیم کا کام ہے۔ اگر اس موقع پر حضرت وعظ فرماتے تو بجائے اصلاح کے ان کا ایمان بھی جاتا رہتا۔

خوب سمجھ لو کہ اگر ایسے موقع پر منع کیا تو دو حال سے خالی نہیں یا تو اور زیادہ ضد میں آکر غلط کام کریں گے یا استخفاف کریں گے (حقیر سمجھیں گے) اگر استخفاف کریں گے تو کافر ہو جائیں گے اور ان کے کفر کا سبب یہ وعظ ہوگا۔ ایسے امر کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے ماں باپ کو گالیاں مت دو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے نہایت

تعجب سے پوچھا کہ حضورؐ! اپنے ماں باپ کو کون گالیاں دیتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ کسی کے ماں باپ کو گالیاں دے وہ اس کے ماں باپ کو گالیاں دے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سبب بھی مباشر (کرنے) کے حکم میں ہے تو جب تم سبب ہوئے ان کے کفر کے تو گویا تم نے کفر کی تعلیم دی۔

میں ایک دفعہ کہہ کر بہت پچھتایا۔ ایک صاحب خلاف شرع وضع بنائے ہوئے ریل میں بیٹھے تھے۔ میں نے کہا کہ شریعت کے خلاف ہے تو اس نے کہا کہ شریعت کی یوں کی یوں۔ یعنی ماں کی گالی دی۔ میں بہت پچھتایا کہ اتنا فحش آدمی ہے۔ میں نے اس سے کیوں کہا۔

میں سمجھتا ہوں کہ شریعت کی گستاخی ان ناصحین کی بدولت ہوئی۔ یہ خواہ مخواہ انہیں چھیڑتے ہیں اور خود بھی برا بنتے ہیں اور شریعت کو بھی بُرا کہلواتے ہیں۔ (التبشیر ملحقہ دعوت و تبلیغ ص۲۸۵)

عُمدہ تمثیل

امام غزالیؒ کے فتوے عجیب غریب ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مکہ معظمہ کے متعلق شوقیہ مضامین کا بیان کرنا ایسے شخص کے سامنے جائز نہیں۔ جس کے لئے حج کرنا جائز نہیں مثلاً وہ شخص جو اہل وعیال کا خرچ بھی پورا نہ کرسکتا ہو اور سب کو چھوڑ کر حج کو چل دے ایسے شخص کے سامنے مکہ معظمہ کے شوقیہ مضامین (بیان کرنا) حرام ہے۔ اب وحشت ہوئی کہ مکہ کے فضائل بیان کرنے کو حرام فرماتے ہیں۔ اس واسطے حرام فرماتے ہیں کہ وہ سن کر چل پڑے گا اور گنہگار ہوگا اور اس کے گناہ کا سبب یہ فضائل بیان کرنے والا ہوگا۔

ایسے امور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہیں۔ بنی ثقیف جس وقت مسلمان ہونے آئے تو حضورؐ سے یہ شرط کی کہ ہم مسلمان تو ہوتے ہیں مگر نہ زکوٰۃ

دیں گے نہ جہاد کریں گے۔ آپؐ نے فرمایا اچھا۔ لوگوں کو بڑی وحشت ہوئی کہ فرض چھوڑنے کی اجازت دے دی۔ آپؐ نے فرمایا مسلمان تو ہونے دو مسلمان ہو کر سب کچھ کریں گے۔ (التبشیر ملحقہ دعوت و تبلیغ ص۳۹۶) ۱۴۲

مولانا اسماعیل شہیدؒ کی حکایت

مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جب لکھنؤ تشریف لے گئے اس وقت وہاں شیعہ کی حکومت تھی۔ مولانا ایک سنی کے ہاں مہمان ہوئے جو شاہی دربار میں کسی عہدہ پر ممتاز تھے اس زمانہ کے اکثر سلاطین میں تعصب نہ تھا اس لیے سنی بھی ان کے دربار میں عزت سے رہتے تھے جب بادشاہ کو مولانا کا تشریف لانا معلوم ہوا تو زیارت کا اشتیاق ہوا کیونکہ مولانا اسماعیل صاحب کی شہرت اور عزت اس زمانہ میں بہت زیادہ تھی۔ آپ کو ایک خاص امتیاز حاصل تھا جو علماء میں کسی کو بھی اس زمانہ میں حاصل نہ تھا حالانکہ مولانا آپ کو مٹائے ہوئے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص عزت دی ہوئی تھی۔ مخالفین بھی مولانا کے کمال کے معتقد تھے چنانچہ لکھنؤ کے بادشاہ گو مذہباً شیعہ تھے مگر مولانا کا نام سن کر زیارت کے مشتاق ہوئے اور آپ کا وعظ سننا چاہا تو انہوں نے مولانا کے میزبان سے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ کے یہاں مولانا اسماعیل صاحب تشریف لائے ہیں ہم ان کی زیارت کرنا اور وعظ سننا چاہتے ہیں۔ میزبان کو بڑی فکر ہوئی کہ یہ بلا سر لگی۔ کیونکہ مولانا صاف گو بہت ہیں وہ وعظ میں کسی کی رعایت نہ کریں گے۔ شیعہ کی بھی خوب خبر لیں گے جو بادشاہ کو ناگوار گذرے گی مگر ادھر سے اصرار بڑھتا گیا آخر سنی میزبان نے مولانا سے آکر عرض کیا کہ بادشاہ آپ کی زیارت اور وعظ کے مشتاق ہیں میں کئی روز تک اُن کو

ٹالتا رہا مگر وہ اصرار پہ اصرار کیے جاتے ہیں اس لیئے بہتر ہے کہ ان کی درخواست کو آپ منظور فرمالیں مگر خدا کے لیئے وعظ میں شیعہ اور سنی کے اختلاف کا ذکر نہ فرمایئے گا کیونکہ بادشاہ شیعہ ہے اس کو یہ امر ناگوار ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ اس سے بے فکر رہیں میں ایسا بیوقوف نہیں ہوں جو کچھ کہوں گا موقع کے مناسب کہوں گا۔ واقعی سچ فرمایا کیونکہ آپ نے جو کچھ بھی فرمایا وہ موقع کے مناسب ہی تھا۔ گو بعض کی سمجھ میں نہ آئے۔

اس کے بعد مولانا شاہی محل تشریف لے گئے بادشاہ نے بڑی تعظیم کے ساتھ آپ کا استقبال کیا پھر وعظ شروع ہوا جس میں تمام درباری مع بادشاہ کے اور لکھنؤ کے سب علماء اور شیعوں کے مجتہد وغیرہ سب ہی جمع تھے۔ مولانا نے تمہید میں فرمایا کہ صاحبو! اول وعظ کی حقیقت سن لیجیئے وہ ایک روحانی علاج ہے اور علاج ہوتا ہے امراض کا تو اب اگر میں وعظ کی حقیقت پر نظر کرتا ہوں تو اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جس مرض میں مخاطب مبتلا ہیں اس کا علاج کروں ورنہ پھر وعظ ہی کیا ہوگا اور میں دیکھتا ہوں کہ بادشاہ میں رفض (شیعت) کا مرض ہے مگر ہمارے فلاں میزبان صاحب (جن کے ہاں میں ٹھہرا ہوں) وہ کہتے ہیں کہ مذہبی نزاعات و خلافیات (اختلافی مسائل) کا بیان نہ ہو۔ مگر میں وعظ میں اسی بدعت کا علاج کروں گا۔ اس تمہید میں آپ نے میزبان کو بھی آفت سے بچالیا اور بتلا دیا کہ وہ تو نزاعی (اور اختلافی) مسائل کے بیان کرنے سے منع کرتے تھے مگر میں نے ہی ان کی رائے قبول نہ کی تو ان پر کچھ الزام نہیں۔

اس کے بعد مولانا نے ایک آدھ آیت پڑھ کر صحابہ کے مناقب وفضائل (بیان کرنا شروع کر دیئے اور ساتھ ہی اہل بیت کے بھی مناقب بیان فرمائے اور درمیان درمیان میں شیعہ و سنی کے اختلافی مسائل کا بھی بیان فرمایا۔ اور شیعہ مذہب کا خوب ابطال (رد) کیا۔ بادشاہ کی تو یہ حالت تھی

کہ اول سے آخر تک سکتہ کی سی حالت میں بیٹھے رہے اور وعظ ختم ہوتے ہی بادشاہ اٹھے اور بہت تعظیم و تکریم کے ساتھ مولانا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بعض شیعہ علماء کو نواب صاحب کی اس تعظیم و تکریم کے ساتھ حسد پیدا ہوا۔ اور انہوں نے وعظ کے بعد مولانا پر کچھ اعتراضات شروع کئے جن میں سے ایک اعتراض منقول بھی ہے وہ یہ کہ مجتہد شیعہ نے کہا کہ مولانا تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت علی رضؓ نے حضرت معاویہ رضؓ کو کبھی بُرا نہیں کہا اور حضرت معاویہ رضؓ نے ہمیشہ آپ کی شان میں گستاخی کی ہے اس سے دونوں کی حالت کا فیصلہ ہوتا ہے مولانا نے جواب دیا کہ اس سے ان دونوں حضرات کا فیصلہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر ہمارا اور آپ کا فیصلہ تو ہو ہی گیا کیونکہ اس سے معلوم ہوگیا کہ آپ حضرت معاویہ کے طریقہ پر ہیں اور ہم حضرت علی کے طریقہ پر ہیں کیونکہ ہم کسی کو بُرا بھلا نہیں کہتے اور تم رات دن تبرا کرتے ہو اس جواب سے مجتہد دم بخود رہ (بالکل خاموش) رہ گیا۔ بادشاہ نے کہا کہ قبلہ کچھ اور سُننا ہو تو اعتراض کیجئے۔

یہ حکایت میں نے اس پر بیان کی تھی کہ محقق ہمیشہ ضرورت اور مخاطب کی حالت کے لحاظ سے مضمون اختیار کرتا ہے۔

(اصلاح ذات البین ملحقہ آداب انسانیت ص۲۵۰)

وعظ و تقریر و فتویٰ میں کسی کی بُرائی اور تکفیر و تضلیل کرنے کا حق صرف علماء کرام کو ہے۔

کسی کو بُرا کہنے کا منصب عوام کا نہیں بلکہ یہ علماء کا منصب ہے۔ تم کسی سے کچھ نہ کہو بلکہ یہ کام جس جماعت کا ہے اسی پر چھوڑ دو اور علماء کو۔

فاسقوں کے بُرا کہنے کا منصب تو ہے ہی اُن کو تو یہ بھی حق حاصل ہے کہ اچھوں کو بھی بُرا کہہ دیں اگر انتظام شریعت کے لئے اس کی ضرورت واقع ہو چنانچہ شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کو ایک بزرگ عالم ساری عمر زندیق کہتے رہے مگر جب شیخ اکبر کے انتقال کی خبر آئی تو رونے لگے اور فرمایا کہ افسوس کہ آج بہت بڑے صدیق کا انتقال ہو گیا لوگوں کو حیرت ہوئی کہ عمر بھر تو ان کو زندیق کہتے رہے اور آج بہت بڑا صدیق بتلاتے ہیں۔ آخر دریافت کیا کہ اگر وہ ایسا عالی مرتبہ والا شخص تھا تو آپ نے زندیق کہہ کر ہم کو اس کے برکات و فیوض سے کیوں محروم رکھا؟ فرمایا واقعی وہ بہت بڑا صدیق تھا مگر تم کو اس سے کچھ نفع نہ ہوتا اگر تم اس کی صحبت میں رہتے تو زندیق ہی بن جاتے کیونکہ ان کے دقیق علوم عام عقلوں سے بالاتر تھے تم ان کی باتوں کو سُن کر سمجھ کے موافق مطلب نکالتے اور حقیقت تک نہ پہنچتے اور زندقہ میں مبتلا ہوتے اس لئے میں تم کو ان سے بچاتا رہا اور ظاہر میں زندیق کہتا رہا غرض علماء نے انتظام شریعت کے لئے بعض اچھے آدمیوں کو بھی جان کر بُرا کہا ہے مگر یہ علماء ہی کا منصب ہے عوام کا منصب نہیں ہے

(سبیل النجاح ملحقہ دین و دنیا صـ۲-۱۰)

تکفیر کے باب میں احتیاط

علماء کو مجبور ہونا پڑتا ہے کہ یہ فیصلہ کریں کہ کون مسلم ہیں۔ کون کافر کون صالح کون فاسق مگر کسی معین شخص کے لئے ایسا حکم کرنا بڑا کٹھن کام ہے بڑی احتیاط لازم ہے۔ ~ (مجالس حکیم الامت صـ۱۰۸)

میں اہل علم کو تنبیہ کرتا ہوں کہ فتوی میں یہ طریق اختیار کریں کہ کسی کے کہنے سے دوسرے پر فتوی نہ لگائیں اسی طرح کسی پر کفر کا فتوی نہ دیں۔ (کلمۃ الحق صـ۴۳)

باب ۱۰ ضروری ہدایات و تنبیہات

واعظ کو خیر خواہ اور مشفق ہونا چاہیئے۔ ناصح کی دو قسمیں اور خیر خواہی و شفقت کا مقتضیٰ

ناصح دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو ضابطہ کے ساتھ نصیحت کرنے والا وہ تو اپنے ضابطہ کی خانہ پوری کر دیتا ہے۔ دوسرا وہ ناصح جس کو سامعین پر شفقت بھی ہے مثلاً ایک تو منادی کا حکم سناتا ہے اور ایک باپ کا نصیحت کرنا دونوں میں بڑا فرق ہے۔ منادی کا کام تو ضابطہ کا ہے صرف حکم پہنچانا اس کا فرض منصبی ہے اب تو مانو یا نہ مانو اس سے اس کو کوئی بحث نہیں۔ اور باپ محض سنانے پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی شفقت اس بات کی مقتضی ہوتی ہے کہ کسی صورت سے اس کو منوا لوں۔ اس لیے وہ ایسی صورت اختیار کرتا ہے کہ بیٹا مان ہی لے تو دیکھیئے دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ باپ اگر بیٹے کو کسی مضر نقصان دہ چیز سے روکتا ہے تو اتنا کہہ دینا کہ یہ چیز مت کھانا حاکمانہ حق ادا کرنے کے لئے کافی ہے۔ آگے اس کو اختیار ہے چاہے احتراز کرے یا بھاڑ میں پڑے۔ مگر باپ اتنی بات پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ شفقت کی وجہ سے کہتا ہے کہ بیٹا یہ چیز مضر ہے۔ دست آور ہے اسے مت کھانا یہ پیٹ میں درد پیدا کر دے گی اس کے کھانے سے پھنسیاں نکل آئیں گی تو اتنا لگا لپٹنا شفیق ہونے کی حیثیت سے ہے ورنہ اس کو خوف دلانے کی کیا ضرورت پڑی تھی

سی طرح کبھی طمع (لالچ) دلانے سے کام لیتا ہے۔ کہ اگر یہ دوا پیو گے تو تم کو یہ دوں گا وہ دوں گا۔
ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسا کوئی شفیق نہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کوئی خیر خواہ نہیں تو محض شفقت ہی کے مقتضیٰ سے اللہ تعالیٰ نے اولاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ثانیاً آپ کی امت کو فرمایا ہے کہ دعوت میں صرف حکمت یعنی دلائل ہی پر اکتفا نہ کرو۔ بلکہ ساتھ ساتھ موعظہ حسنہ بھی کرتے رہو۔ (آداب التبلیغ ص۱۱۲)

وعظ میں ترغیب و ترہیب اور فضائل بیان کرنیکی ضرورت

موعظہ حسنہ سے مراد ایسے مضامین مؤثرہ (اثر کرنے والے) ہیں جس سے مخاطب میں نرمی پیدا ہو۔ دل پگھل جائے۔
اور مضامین مرققہ (نرمی پیدا کرنے والے مضامین) کا مصداق ترغیب و ترہیب ہے کہ جنت کے درجات کی ترغیب جہنم کے درکات سے ترہیب کرنا ونحو ذلك۔
اصل مقصود تو احکام کا سنانا ہے باقی مخاطب کے متاثر کرنے کے لئے ترغیب و ترہیب کا بھی ایک درجہ ہے۔ گو وہ بھی ایک حیثیت سے احکام ہی میں سے ہے۔ مثلاً جنت و دوزخ کا عقیدہ رکھنا تو اصول میں سے ہے اور احکام میں ہی داخل ہے مگر دوسری حیثیت سے ترغیب و ترہیب ہے یعنی جہاں احکام سنانا اور جنت و دوزخ کا معتقد بنانا مقصود نہ ہو صرف ترقیق قلب (دل نرم کرنا) مقصود ہو وہاں ترغیب و ترہیب ہے۔
مثلاً کسی کو کہنا کہ اگر نماز پڑھو گے تو ایسی جنت ملے گی جس کی یہ شان ہے یہ حالات ہیں اس کے اندر ایسی ایسی آسائشیں ہیں اگر نہیں پڑھو گے تو دوزخ

میں جائے گے جس کے یہ واقعات ہیں۔ تو یہ مضمون ترغیب و ترہیب کی حیثیت سے دل کو نرم کرنے والا ہے اس سے مخاطب کے قلب میں احکام کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی پھر عمل کرنے کی توفیق ہوگی کیونکہ شروع شروع میں تو عمل تکلف سے ہوتا ہے کیونکہ طبیعت کے خلاف کام ہے۔ اس واسطے کوئی امر آمادہ کرنے والا اور اُبھارنے والا ہونا چاہیئے۔ طبیعت کے خلاف دنیا کا کوئی کام بھی بلا طمع (بغیر لالچ) یا بغیر خوف کے نہیں ہوتا ہے۔ پھر (اس کے بعد کرتے کرتے) عادت ہو جاتی ہے تو ترغیب و ترہیب کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ (لیکن شروع میں ہوتی ہے) اس لئے ترغیب و ترہیب کی ضرورت ہوئی۔ (دعوت و تبلیغ وعظ آداب التبلیغ صفحہ ۱۱۲)

وَعظ کا ایک ضروری اَدَبْ حضرتْ شاہ عَبدالقادِر صاحبؒ کی حکایتْ۔

اَب میں علماء کی طرف رجوع ہوتا ہوں آپ کو عوام کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرنا چاہیئے ان کو ذلیل و حقیر نہ سمجھنا چاہیئے۔ وعظ کے آداب میں سے یہ ہے کہ وعظ میں خاص طور پر کسی سے تعرض نہ ہو بلکہ عام خطاب ہونا چاہیئے۔

شاہ عبد القادر صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ آپ وعظ فرما رہے تھے کہ اسی مجلس میں ایک شخص پر نظر پڑی جس کا جامہ ٹخنوں سے نیچے تھا کوئی آج کل کا مولوی ہوتا تو وعظ ہی میں اس کی خبر لیتا یا کچھ بھی نہ کہتا مگر شاہ صاحب نے وعظ میں تو اس سے کچھ تعرض نہ کیا کیونکہ آداب وعظ میں سے یہ بات ہے کہ وعظ میں خاص تعرض نہ ہو بلکہ خطاب عام ہونا چاہیئے

اور امر بالمعروف کو ترک نہیں کیا بلکہ جب وعظ ہو چکا تو آپ نے ان صاحب سے فرمایا کہ تم ذرا ٹھہر جاؤ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے وہ تو سہم گیا کہ بس اب میری خبر لی جائے گی۔

مگر اہل اللہ کے یہاں کسی کی خبر نہیں لی جاتی۔ بلکہ خبر دی جاتی ہے۔ چنانچہ سب لوگ چلے گئے تو آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھائی میرے اندر ایک عیب ہے جس کو تم پر ظاہر کرتا ہوں وہ یہ کہ میرا پاجامہ کھسک کر ٹخنوں سے نیچے پہنچ جاتا ہے اور اس کے متعلق حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔ اس کے بعد آپ نے سب وعیدیں بیان کر دیں پھر کھڑے ہو کر فرمایا دیکھنا میرا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے تو نہیں ہے؟ اس شخص نے شاہ صاحب کے پیر پکڑ لیے اور کہا کہ حضرت آپ میں یہ عیب کیوں ہوتا۔ یہ مرض تو مجھ نالائق میں ہے میں آج سے توبہ کرتا ہوں انشاء اللہ پھر ایسا نہ ہوگا۔

دیکھیے شاہ صاحب نے کس شفقت کے ساتھ نصیحت فرمائی جس کا فوراً اثر ہوا۔ واللہ شفقت کا اثر مخاطب پر ضرور ہوتا ہے ہم کو عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کا سلوک کرنا چاہیے جیسا کہ اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے۔

(العبد الربانی حقوق و فرائض ص۲۸)

مبلغین اور واعظین کی بہت بڑی غلطی۔

بعض غیر محقق واعظین کہہ دیا کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے رزق کا وعدہ فرمایا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ وما من دآبۃ فی الارض الا علی اللہ رزقہا تو پھر لوگ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا اس آیت پر ایمان نہیں ہے۔ سو یاد رکھو کہ یہ الزام بھی غلط ہے کہ اس آیت پر مسلمانوں کا ایمان نہیں۔ نہیں سب کا ضرور ایمان ہے اور ایمان ہونے کے باوجود پریشانی

بھی اسی کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔

اِس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ وعدے دو قسم کے ہیں ایک مبہم اور ایک معین۔ اللہ نے مبہم وعدہ فرمایا ہے کہ رزق ملے گا۔ لیکن یہ نہیں فرمایا کہ کب ملے گا اور کہاں سے ملے گا اور کس طریقہ سے ملے گا اور کتنا ملے گا۔ تو پریشانی ابہام کی وجہ سے ہے۔ اور ساتھ ہی اس مبہم وعدہ پر پورا یقین ہے کہ وقت مقدر پر ضرور ملے گا۔

بعض واعظین اسی الزام کو مؤکد (مضبوط) کرنے کے لئے مثال دیا کرتے ہیں کہ اگر کوئی دوست دعوت کر دے تو اطمینان ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اطمینان نہیں؟ یہ بھی غلط اور قیاس مع الفارق ہے اور خواہ مخواہ مسلمانوں کو کافر بنانا ہے۔ واللہ اگر حق تعالیٰ کے کلام مجید میں معین وعدہ ہوتا تو ہرگز ہرگز کسی کو پریشانی نہ ہوتی اور اگر دعوت میں بھی وقت معین نہ کیا جائے مبہماً کہہ دیا جائے کہ کسی وقت کی دعوت ہے تو وہاں بھی اطمینان نہ ہوتا۔ یہاں اتنی بات فرمائی ہے کہ رزق ملے گا۔ اس پر ایمان ہے۔ شریعت میں غلو نہ کرنا چاہیئے جس قدر جو بات ثابت ہو اسی پر رہنا چاہیئے۔ اہل کتاب کو ارشاد ہے۔ یا اھل الکتاب لاتغلوافی دینکم۔ یعنی اے اہل کتاب دین میں غلو نہ کرو۔ فرض میں ان کے غیر مکلف ہونے کے باوجود ان کو (اہل کتاب) کو خطاب کیا گیا تو ہم تو بدرجہ اولیٰ اس حکم کے مکلف ہوں گے۔

ایک اور تنبیہ

اسی طرح غیر محقق واعظ ایسی چھری پھیرتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر بناتے چلے جاتے ہیں چنانچہ جو لوگ نماز میں سستی کرتے ہیں ان کو منافق کہہ دیتے ہیں اور آیت پڑھ دیتے ہیں۔ واذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالیٰ ۔

(جب منافقین نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو سستی سے کھڑے ہوتے ہیں)
یہ آیت منافقین کی شکایت میں ہے کہ وہ نماز کے واسطے کھڑے ہوتے
ہیں کہ کاہل (سست) ہوتے ہیں۔ (مفاسد گناہ الجناح ص۱۰۴)

خوب سمجھ لو کہ کسل اعتقادی اور شئ ہے اور کسل طبعی جدا شئ ہے۔ منافقین میں کسل اعتقادی تھا۔ یعنی ان کو فرض نہ سمجھنے کی وجہ سے کسل تھا اور مسلمانوں میں کسل طبعی ہے فرض ہونے میں تردد نہیں اس کو دوسرے عنوان سے سمجھئے کہ بعض مرتبہ لازم اعم ہوتا ہے اور اس کا تعلق ملزومات متعددہ سے ہوتا ہے کسل لازمی شئ ہے۔ منافقین میں اس کا ملزوم اعتقاد کی سستی ہے اور مسلمانوں میں طبع ہے۔ مسلمان کیسا ہی ضعیف الایمان ہو اس کو کسل اعتقادی کبھی نہ ہوگا۔ تو یہاں مطلق کسل مراد نہیں لیکن ہمارے واعظین سب کو ایک لکڑی سے ہانک دیتے ہیں

اسی طرح آیت واذا مس الانسان ضر دعانا الآیہ۔ کفار کے بارے ارشاد ہے کہ جب کوئی مصیبت ہوتی ہے تو خدا کو پکارتے ہیں اور جب وہ مصیبت جاتی رہتی ہے تو پھر غفلت میں پڑ جاتے ہیں۔ تو یہی حالت بعینہٖ مسلمانوں کی بھی ہے تو کیا مسلمان بھی اس آیت کے تحت داخل ہیں اگر داخل ہیں تو مفسرین کفار سے اس کی تفسیر کیوں کرتے ہیں؟ اس کا بھی یہی جواب ہے کہ مسلمان کے اندر اس کا منشا طبیعت ہے اگرچہ یہ بھی کمی اور قابل اصلاح ہے لیکن اس غفلت سے کفر لازم نہیں آتا اور کافرین کے اندر اس کا منشاء اعراض وانکار اور کفر ہے۔

(مفاسد گناہ ص۱۰۴۔ مفاسد گناہ الجناح ص۱۰۵)

واعظ کو اپنے وعظ و تقریر پر غرور نہ ہونا چاہئیے وعظ و تقریر اور مضامین کی آمد کو اپنا کمال نہ سمجھنا چاہئیے۔

ہر مجلسِ وعظ میں (عموماً) کوئی نہ کوئی ایسا ہوتا ہے جو اللہ کے نزدیک

IMP مقبول ہوتا ہے۔ واعظ صاحب اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ علوم و معارف جو میں بیان کرتا ہوں یہ میرا کمال ہے۔ صاحبو! نہ معلوم یہ کس اللہ کے بندے کی برکت سے بیان ہوتے ہیں۔

بعض دفعہ وعظ میں کوئی بزرگ ہوتے ہیں۔ وعظ سن کر ان کا جی خوش ہوتا ہے حق تعالیٰ ان کی خوشی کی برکت سے واعظ کو بھی نواز لیتے ہیں۔

ایک حکایت

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ کسی عالم کے وعظ میں بیٹھے ہوئے تھے اور وعظ کی طرف متوجہ تھے ان کی توجہ کی برکت سے وہ عجیب عجیب علوم بیان کرتے رہے۔ درمیان وعظ میں عالم صاحب کو عجب پیدا ہوا اور وہ اپنے علوم پر دل ہی میں فخر کرنے لگے تو بزرگ نے اپنی توجہ دوسری طرف متوجہ کر دی بس ان کی توجہ کا بند ہونا تھا کہ عالم صاحب کو مضامین کی آمد بند ہوگئی۔ IMP

اس سے معلوم ہوا کہ یہ علوم کسی دوسرے کی توجہ سے آرہے تھے۔

ہمارے حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ بعض سامعین مثل طفل (بچہ کے مانند) ہوتے ہیں۔ جس طرح بچہ کی کوشش سے ماں کے پستان میں دودھ (قدرتاً) اترتا ہے اور اگر وہ دودھ پینا چھوڑ دے تو چند روز میں چھاتیاں اکڑ کر رہ جاتی ہیں اور دودھ کی آمد بند ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سامعین کی طلب و کشش سے واعظ کے قلب میں علوم القاء ہوتے ہیں اگر یہ طلب نہ ہو تو شیخ صاحب کورے کے کورے رہ جائیں۔

کسی کو اپنے حفظ یا علم پر ناز نہ کرنا چاہئے حق تعالےٰ اگر چاہیں تو ایک سیکنڈ میں سب چھین لیں پھر کورے کے کورے رہ جاؤ۔ چنانچہ ان عالم صاحب کو وعظ میں عجب و ناز پیدا ہوا تھا ان بزرگ نے اپنی توجہ فوراً ہٹالی۔ ان کا توجہ ہٹانا

تھا کہ سب علوم بند ہو گئے ۔ (العبد الربانی ملحقہ حقوق و فرائض ص۱۸۱)

حضرت تھانویؒ کا واقعہ

خود میرا واقعہ ہے کہ ایک بار میں گڑھی خام جو ہمارے قصبہ سے قریب ایک بستی ہے وہاں لوگوں نے وعظ کی درخواست کی۔ میں نے وعظ کا وعدہ کر لیا اور اس وقت قلب میں یہ وسوسہ ہوا کہ بحمد اللہ مجھے وعظ پر قدرت حاصل ہے۔ اس کے بعد جو وعظ کہنے بیٹھے تو خطبہ اور آیت پڑھ کر رہ گیا مضمون بھی (ذہن میں) کچھ نہ آیا۔ ہر چند بہت زور لگایا مگر چل ہی نہ سکا۔ پھر خیال ہوا کہ میں نے اتنے وعظ کہے ہیں لاؤ ان ہی میں سے ایک کا اعادہ کر دوں مگر پہلے مواعظ کا مضمون بھی کچھ یاد نہ آیا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ یہ میرے اس وسوسہ کا جواب ہے جو حق تعالیٰ نے دکھلایا کہ تم خود (کچھ) نہیں بیان کر سکتے بلکہ ہم ہی کہلوانا چاہتے ہیں تو سب کچھ کہہ سکتے ہو۔ (العبد الربانی ص۱۰)

چونکا دینے والی آیت

اور اس روز اس آیت کی تفسیر منکشف ہوئی۔ ولئن شئنا لنذھبن بالذی اوحینا الیک ثم لا تجد لک بہ علینا وکیلا۔ یعنی اگر ہم چاہیں تو وہ تمام علوم جو آپ کو دئیے ہیں دفعتہً سب کو سلب کر لیں پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کسی کو اپنا کارساز و مددگار نہ پائیں گے۔

اسی طرح ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔ وان یشاء اللہ یختم علی قلبک۔ یعنی اگر اللہ چاہے تو آپ کے دل میں مہر لگا دے۔

اللہ اللہ کتنا سخت کلمہ ہے۔ کتنا ہولناک خطاب ہے آپ ڈر ہی

تو گئے ہوں گے۔ نہ معلوم یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر کیا گذری ہوگی۔ تعجب نہیں کہ یاس کی نوبت آجاتی اسی لیے حق تعالیٰ نے یہ جز آگے بڑھا دیا۔ الا رحمة من ربك پس رحمت خداوندی ہی ساتھ دے سکتی ہے اور کوئی ساتھ نہیں دے سکتا۔

ان الفاظ کے جوڑنے سے پتہ چلتا ہے اس حالت کا جو آیت کے اترنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر گذری ہوگی۔ کہ اتنے لفظ پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ الا رحمة من ربك۔ کیونکہ اس سے اتنا معلوم ہوا کہ رحمت دستگیری کر سکتی ہے مگر اس کا وقوع ہوگا یا نہیں اس لفظ سے اس کا اطمینان نہیں ہوتا اس واسطے ایک جملہ اور بڑھا دیا۔ انّ فضله كان عليك كبيرًا یعنی چونکہ خدا تعالیٰ کا فضل آپ کے شامل حال ہے اس لیے بالفعل رحمت آپ کی دستگیر ہے آپ کسی طرح کا اضطراب نہ کریں۔ بس اس لفظ سے یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان ہوگیا ہوگا۔ کہ ایسا واقع نہ ہوگا کہ علوم سلب ہوجائیں۔ صرف اظہار قدرت اور تصحیح عقیدہ کے لئے ایسا فرمایا گیا۔

مگر آج کل لوگ اس فکر میں ہیں کہ نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا بنا دیں۔ میں کہتا ہوں کہ تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص کرتے ہو کیونکہ ہم آپ کو عبد اللہ کہتے ہیں اور عبد بھی کیسا عبد کامل۔

اگر کسی کو اپنے علم پر ناز ہو تو سن لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر تو کسی کو علم عطا نہیں ہوا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ گفتگو ہے تو دوسروں کا کیا کہنا ہم کو ذرا ہوش سنبھالنے کی ضرورت ہے۔ کسی کو علم پر ناز ہے تو حماقت ہے۔ عمل پر ناز ہے تو حماقت ہے۔ عرفان پر ناز ہے تو حماقت ہے ان میں کوئی چیز بھی اس درجہ میں مکتسب نہیں جس پر ناز کیا جائے۔ جس کو جو چیز حاصل ہے وہ سب عطاء الٰہی ہے اس کو اپنی چیز سمجھنا اور تزکیہ نفس کرنا کبر ہے۔

IMO

کسی کو اپنے حفظ یا علم پر ناز نہ کرنا چاہیئے حق تعالیٰ اگر چاہیں تو ایک سیکنڈ میں سب چھین لیں پھر کورے کے کورے رہ جاؤ۔

(العبد الربانی ص۹۹، ص۱۰۸، التبلیغ ص۱۸، العلم والعلماء ص۲۰)

ایک بڑی کوتاہی، عوام سے سلام کرنے سے عار۔

ہماری حالت یہ ہے کہ ہمارے اندر تکبر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ہم کو اپنے علم پر ناز ہے۔ دوسرے مسلمانوں کو ہم اپنے سے کمتر اور حقیر سمجھتے ہیں۔ ہمارے عمل کی یہ حالت ہے کہ مولوی صاحب تکبر کی وجہ سے کسی عامی شخص کو کبھی خود سے سلام نہ کریں گے۔ میں خود اپنی حالت بیان کرتا ہوں کہ راستہ میں کوئی ایسا مسلمان ملتا ہے کہ اصطلاحی عالم نہ ہو تو اس کو ابتداً سلام کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

مجھے علماء سے شکایت ہے کہ ہم لوگ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں۔ عوام کو سلام کرنے سے ہم کو عار آتی ہے۔ یہ اس کے منتظر رہتے ہیں کہ پہلے دوسرے لوگ ہم کو سلام کریں۔ ہم عوام کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ مناسب یہ تھا کہ ہم ان کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرتے۔ بتلائیے اگر ایک تندرست آدمی بیمار کو دیکھے تو اس کو مریض کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اس کو دیکھ کر رحم آتا ہے۔ ایسے ہی مناسب یہ تھا کہ علماء عوام پر رحم کرتے اور ان سے شفقت برتتے۔ (العبد الربانی ملحقہ حقوق و فرائض ص۴۶)

واعظ صاحبان کیلئے اہم ہدایات اور ضروری تنبیہ۔

جس کے سپرد حق تعالیٰ نے اصلاحِ خلق کا کام کر دیا ہو اس شخص کو بھی

تفتیشِ حالات کی ضرورت ہے۔ حالات کا علم ہوئے بغیر اصلاح ممکن نہیں مثلاً کوئی شخص مصلحِ قوم ہو اس کو بھی مجموعی طور سے قوم کے حالات کا علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے ورنہ وعظ و نصیحت کچھ بھی نہ کر سکے گا مگر مصلح کو بھی اسی وقت اجازت ہے جب کہ تفتیش سے مقصود اصلاح ہو اور اگر تحقیر کے لئے ایسا کرے گا تو اس کو بھی ہرگز اجازت نہ ہوگی۔ إنما الاعمال بالنیات اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ (دعوات عبدیت ص ۹۲/۱۲)

اور یہ جو میں نے کہا کہ اصلاحِ قوم کے لئے حالات کی تفتیش جائز ہے اس کے کچھ آداب بھی ہیں ان کو معلوم کر لینا ضروری ہے۔

ایک ادب تو اس کا یہ ہے کہ کسی شخص کی اصلاح عام مجمع میں نہ کی جائے اگر مجمع میں عام خطاب (یعنی وعظ و تقریر میں) کرے تو ایسے پتے نہ دے (اور ایسی باتیں نہ کہے کہ لوگ سمجھ جائیں کہ فلاں شخص کو کہا جا رہا ہے) کہ عوام میں اس کی رسوائی ہوتی ہے۔ شرمندگی ہوتی ہے اور اس شرمندگی کا اثر یہ ہوتا ہے کہ نصیحت کرنے والے سے (واعظ اور مقرر و مصلح صاحب سے) بغض ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس امر (ناجائز) کو ترک کرنے کے بجائے اس میں اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے۔ کہ میری رسوائی تو ہو ہی گئی پھر میں کیوں چھوڑوں۔

مجھے ایسا سابقہ بہت پڑتا ہے یعنی یہ فرمائش کی جاتی ہے کہ فلاں شخص سود لیتا ہے ذرا وعظ میں اس کی خبر لیجئے گا۔ یا فلاں شخص نے حقوق دبا رکھے ہیں ذرا اس کے متعلق فرما دیجئے گا۔ لیکن بحمد اللہ ان فرمائشوں پر کبھی عمل نہیں کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اصلاح کا یہ طریقہ بجائے مفید ہونے کے مضر ہے۔ سننے والے قرائن سے سمجھ جاتے ہیں کہ فلاں کو کہا جا رہا ہے اور اس سے عام مجمع میں اس کی شرمندگی ہوتی ہے جس کا نتیجہ بغض و عداوت ہے اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اگر واقعی ان لوگوں کی اصلاح منظور ہو تو پہلے ان سے میل جول پیدا کیا جائے جب خوب بے تکلفی ہو جائے

تو وقتاً فوقتاً نرمی سے ان کو سمجھایا جائے اور خدا تعالیٰ سے ان کے لئے دعا کی جائے اور جو تدبیریں ثابت ہوں ان کو عمل میں لایا جائے۔

(نسیان النفس ملحقہ آداب انسانیت ص۱۱۶)

لوگوں کی عام غلطی اور واعظ کے لئے ضروری ہدایت

آج کل لوگوں کی یہ عادت ہے کہ جہاں کہیں کوئی مولوی باہر کا کسی شہر میں پہنچا اور لوگوں نے اس سے سوالات کرنا شروع کر دیئے۔ یہ بھی بہت بڑا مرض ہے کیونکہ پردیسی آدمی کو شہر کے واقعات پوری طرح معلوم نہیں ہوتے اور پوچھنے والے جہالت کی وجہ سے پوری بات بیان نہیں کرتے۔ وہ (مقرر) جتنی بات سنتا ہے اس کے موافق جواب دے دیتا ہے اس کو یہ لوگ فتویٰ قرار دے کر وہاں کے علماء سے الجھتے ہیں کہ تم نے تو یہ کہا تھا اور فلاں عالم یہ فرما گئے ہیں۔ حالانکہ ممکن ہے کہ وہاں کے علماء کو واقعہ کی پوری تحقیق ہو (اور صحیح صورتِ حال کا علم ہو) جس کی بنا پر انہوں نے دوسرا جواب دیا ہو۔

اسی لئے میری عادت ہے کہ سفر میں ایسے سوالات کے جوابات نہیں دیا کرتا اور کہہ دیتا ہوں کہ سوال کی پوری صورت حال لکھ کر ڈاک میں میرے پاس بھیج دینا۔ اطمینان سے جواب دوں گا۔ اس کے بعد وہ کسی سے الجھے گا تو جواب کے ساتھ لوگ اس کے سوال کو دیکھ لیں گے کہ اس نے سوال کس طرح کیا تھا اور زبانی سوال کے جواب میں لوگ صرف جواب کو نقل کر دیتے ہیں۔ اپنے سوال کو پورا نقل نہیں کرتے کہ ہم نے سوال کس طرح کیا تھا۔

ایک مرتبہ رام پور گیا تھا تو وہاں ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ گیارہویں شریف کرنا کیسا ہے؟ میں سمجھ گیا کہ اس کا مقصود میرے مسلک پر عمل کرنا نہیں

ہے بلکہ محض مجھے بدنام کرنا ہے کہ یہ وہابی ہے۔ اس لیے میں نے اس سے یہ سوال کیا کہ تم عمل کے واسطے پوچھتے ہو تو تم کو شہر کے علماء سے پوچھنا چاہیئے جن کی دینداری اور تقویٰ کا تم کو تجربہ ہے۔ مجھ سے تم واقف نہیں ہو۔ صرف آج ہی آپ کی مجھ سے ملاقات ہوئی ہے ایک دن میں تم کو میری دیانت اور تقویٰ کا تجربہ نہیں ہوسکتا۔ میرے ساتھ کچھ دن رہو گے جب میری حالت سے واقف ہوگے۔

اور اگر امتحان لینے کے واسطے پوچھتے ہو تو تم کو میرا امتحان لینے کا کوئی حق نہیں۔ جن لوگوں نے مجھ کو پڑھایا ہے وہ سہ ماہی و ششماہی و سالانہ امتحانات میرے لے چکے ہیں آپ سے میں نے کچھ پڑھا نہیں نہ پڑھنا چاہتا ہوں اس لیے آپ کو میرا امتحان لینے کا کوئی حق نہیں۔ بس اس جواب پر وہ اپنا منہ لے کر رہ گئے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ میں ان کے سامنے اپنا مسلک بیان کر دوں۔ پھر مجھ میں اور وہاں کے علماء میں مناظرہ ہو سو میں ایسا روگ نہیں پالتا۔

بعض علماء کو مناظرہ کا اور بحث و مباحثہ کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ وہاں جاتے ہیں مناظرہ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مناظرہ کے بعد بھی لوگ اسی حال پہ رہتے ہیں۔ ہاں ان کا وقت اچھی طرح برباد ہوتا ہے۔ آج کل مناظروں میں اظہار حق تو مطلوب ہوتا نہیں محض ہار جیت مدنظر ہوتی ہے چنانچہ ہر فریق اسی کوشش میں ہوتا ہے کہ جس طرح ہوسکے دوسرے کی ہر بات کو توڑا جائے چاہے اس کے منہ سے ایک دو بات سچی نکل جائے۔ مگر یہ اس کو بھی رد کرنا چاہتے ہیں۔

(حقیقت تصوف و تقویٰ وعظ ترک مالا یعنی ص۲۸)

واعظ کے مخلص وغیر مخلص ہونے کا معیار۔

دین کا کام وہ ہے جس میں اخلاص ہو۔ علامہ شعرانیؒ نے اخلاص کی ایک علامت لکھی ہے وہ یہ ہے کہ جو کام تم کر رہے ہو اس کام کا کرنے والا تم سے اچھا اس بستی میں آجائے اور وہ کام ایسا ہو جو علی العین واجب نہ ہو جیسے مسجد و مدرسہ کا اہتمام یا وعظ کہنا۔ پیری مریدی کرنا۔ کسی نیک کام
۱۴۰ کے لیے چندہ کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو تم کو اس کے آنے کی خوشی ہو رنج نہ ہو۔ بلکہ تم خود لوگوں کو اس کے پاس بھیجو۔ کہ وہاں جاؤ وہ مجھ سے بہتر ہیں۔ اور سارا کام خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالے کر کے خود ایک گوشہ میں بیٹھ جاؤ اور دل میں خدا کا شکر کرو کہ اس نے ایسے آدمی کو بھیج دیا جس نے تمہارا کام بٹا لیا اگر یہ حالت ہو تو تب تم واقعی مخلص ہو۔

مگر اب تو کسی عالم کی بستی میں کوئی دوسرا چلا آئے جس کی طرف رجوع ہونے لگے تو جلے مرتے ہیں اور دل سے یہ چاہتے ہیں کہ اس شخص سے کوئی ایسی بات ظاہر ہو جس سے عوام بدگمان ہو جائیں گویا اپنے کو وحدہٗ لا شریک سمجھتے ہیں کہ بس تمام لوگوں کو ہماری ہی طرف رجوع کرنا چاہیئے کسی اور کی طرف رُخ بھی نہ کرنا چاہیئے کیونکہ قبلہ و کعبہ تو ہم ٹھہرے پھر دوسری طرف نماز کیسی؟ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اس حالت میں تم ہرگز مخلص نہیں ہو
۱۴۱ بلکہ اخلاص سے مفلس ہو۔

(ترجیح الآخرہ ص۵۰ ملحقہ دنیا و آخرت)

باب ۱۲ ۔۔۔ مختلف جلسوں کے احکام

ربیع الاوّل میں عید میلاد النبیؐ کے جلسے!

کچھ مہینے ایسے ہیں جن کے متعلق کوئی احکام نہیں مثلاً ربیع الاول کہ (از روئے شرع) کوئی حکم اس کے متعلق نہیں بعض لوگوں نے مولود (ذکر میلاد النبیؐ) کو اس میں ضروری کر لیا ہے اور اگر کوئی منع کرے تو کہتے ہیں ذکر رسولؐ سے منع کرتے ہیں۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی نماز پڑھے نجس کپڑوں میں تو اسے منع کریں گے کہ نماز نہ ہوگی بلکہ گناہ ہوگا نیکی برباد ہوگی گناہ لازم ہوگا۔

نعوذ باللہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے کون منع کرتا ہے یہ تو تہمت ہے بلکہ بے طریقہ ہونے کی وجہ سے منع کرتے ہیں اس کا معیار ہمارے پاس صحابہ کا طریقہ ہے چنانچہ اس زمانہ میں ذکر شریف ہوتا تھا نہ مٹھائی کی قید تھی نہ اس طور پر فرش و فروش اور روشنی (سجاوٹ) وغیرہ کا اہتمام تھا نہ کوئی خاص زمانہ مقرر تھا نہ کوئی قیام کرتا تھا بلکہ شوق و محبت سے ذکر کرتے تھے۔ (الوقت ص۲۴۲ ملحقہ حقوق و فرائض)

بعض محبین کی عادت ہے کہ وہ ربیع الاوّل کے زمانہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کا ذکر کیا کرتے تھے اور یہ بڑی خوبی کی بات ہے مگر اس کے ساتھ ان کو جو غلطی واقع ہے اس کا رفع کرنا بھی ضروری ہے۔ (ذکر الرسول ص۲)

بارہ ۱۲ ربیع الاوّل کی تاریخ اگرچہ بابرکت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف اس میں مزید برکت کا باعث ہے لیکن چونکہ اس کی تخصیص

اور اس میں ذکر کا التزام کرنا بدعت ہے اس لیے اس تاریخ کی تخصیص کو ترک کر دیں گے۔ (وعظ السرور ص۲)

بارہ ربیع الاوّل میں ذکر میلاد النبیؐ کی تخصیص شریعت سے ثابت نہیں۔

اس ماہ کی فضیلت کے ہم منکر نہیں فضیلت اس میں ضرور ہے کیونکہ ربیع الاول کے مہینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی اور جس زمانہ میں آپ کی ولادت ہوئی وہ ماہ ایسا نہیں ہے کہ حضورؐ کی ولادت کی وجہ سے اس میں شرف نہ آئے جیسے ولادت شریفہ کا مکان اسی وجہ سے معظم ہے کہ حضورؐ کی جائے ولادت ہے اسی طرح وہ زمانہ بھی شریف ہوگا جس زمانہ میں حضورؐ کی ولادت ہوئی (الظہور ص۶۵)

لیکن ربیع الاول کی فضیلت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس فضیلت والے زمانہ کو بلا دلیل شرعی جس عبادت کے لئے چاہے خاص کر لیا جائے پس ربیع الاول میں فضیلت ہے مگر اس کی تخصیص ذکر نبویؐ کے لئے ثابت نہیں جیسے جمعہ کے روزہ کی تخصیص کی ممانعت حدیث میں آئی ہے۔ باوجودیکہ اس کے فضائل بھی وارد ہیں چنانچہ حدیث میں اس کی فضیلت میں آیا ہے۔ فیه ولد آدم وفیه ادخل الجنة الخ کہ اسی دن میں آدم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی اور اسی دن آپ جنت میں داخل کئے گئے اور اسی روز زمین اتارے گئے)

تو دیکھئے جمعہ کے بارے میں باوجودیکہ یہ فضائل خود حدیث میں ثابت ہیں۔ لیکن اس دن میں تخصیص صوم (روزہ رکھنے کی تخصیص) کی ممانعت ہے

تو ربیع الاول کے فضائل تو منصوص بھی نہیں تو اس میں تخصیص ذکر کی اجازت کیسے ہو گی مگر پھر مکرر کہتے ہیں کہ باوجود اس منع تخصیص کے اس ماہ کی فضیلت کے ہم منکر نہیں فضیلت اس میں ضرور ہے اگر اس میں فضیلت نہ ہوتی تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا کیوں کئے جاتے۔ (وعظ النور ملحقہ مجمع البحور ص۳۳)

ایک شبہ

بعض لوگ آج کل ذکر میلاد النبیؐ میں تخصیصات کے پابند ہیں سو ان حضرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو خاص خاص ازمنہ کے ساتھ مختص کر دیا ہے جیسے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے محبت کا دعویٰ کرنے والوں نے ذکر حسینؓ کو محرم کے ساتھ خاص کر دیا ہے ایسے ہی ان مدعیان محبت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کو ربیع الاول کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔

اور تعجب نہیں کہ میرے اس وقت بیان کرنے سے کسی کے ذہن میں یہ بات آئی ہو کہ بیان بھی شاید اسی وجہ سے ہو رہا ہے کہ یہ مہینہ اسی بیان کا ہے اور اس کے ذہن میں آنے سے دو قسم کے لوگوں کو تعجب ہو گا۔ تخصیصات میں غلو کرنے والوں کو تو یہ تعجب ہو گا کہ یہ لوگ تخصیص پر کلام کرتے ہیں (یعنی منع کرتے ہیں) پھر اس کا ارتکاب کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے کیا ان لوگوں کے قول و فعل مطابق نہیں ہوتے۔ اور تخصیصات کو منع کرنے والوں کو یہ تعجب ہو گا کہ اس نے محققین کا مسلک کیوں چھوڑا بہرحال چونکہ ایک جماعت نے ذکر رسولؐ کو خاص اوقات کے ساتھ خاص کر دیا ہے اس لئے میرے بیان پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ (وعظ النور مجمع البحور ص۵)

ربیع الاوّل میں بیان کرنے کی ضرورت اور شبہ کا جواب۔

ربیع الاوّل کا مہینہ ہے اس میں یہ مضمون بیان کر رہا ہوں تو شاید پڑھے لکھے لوگوں کو یہ شبہ ہو کہ ہم میں اور اہل بدعت میں کیا فرق رہا؟ وہ بھی بیان کے لئے اس ماہ کی تخصیص کرتے ہیں اور تم نے بھی کی۔

تو اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں کوئی تخصیص نہیں تخصیص کیسے ہو یہاں تو کوئی بیان اور کوئی وعظ اس سے خالی نہیں جاتا کہ آپ کی تشریف آوری کی حکمتیں اور اسرار و مقاصد اس میں بیان نہ ہوں۔ لیکن اب بھی شاید کسی کو شبہ ہو کہ اور زمانوں میں تو اس خاص اہتمام کے ساتھ اس کا بیان نہیں ہوا اور اس طرح خاص اسی ماہ میں کیوں کیا گیا تو اس لئے عرض ہے کہ ہم نے اس ماہ کو اس ذکر کے لئے من حیث انہ زمان الولادۃ مخصوص نہیں کیا بلکہ من حیث انہ یذکر فیہ اھل البدعۃ ذکر الولادۃ ولایحترزون عن البدعات (یعنی اس وجہ سے اس ماہ کی تخصیص نہیں کی گئی کہ اس ماہ میں ولادت شریف ہوئی ہے بلکہ اس وجہ سے یہ تخصیص کی ہے کہ اہل بدعت اس ماہ میں ذکر ولادت شریف کی مجلسیں کیا کرتے ہیں اور ان میں بدعات سے نہیں بچتے۔)

جیسے حکیم صاحب اسی وقت دوا دیں گے جب درد ہو اور جب درد جاتا رہا گو دوا دینا اس وقت بھی اسی حیثیت سے کارآمد ہے کہ جب کبھی درد ہوگا استعمال کریں گے لیکن درد کے وقت کو تو اس وقت پر ترجیح ہوگی۔ پس درد اور مرض جب دیکھا جاتا ہے جب ہی وہ دوا

دی جاتی ہے اور وہ مرض اسی ماہ میں شروع ہوجاتا ہے اس لیئے مناسب معلوم ہوا کہ اس کا معالجہ اور اصلاح کی جائے۔ بخلاف اس کے کہ چار ماہ پہلے یا پیچھے یہ مضمون بیان کیا جاتا تو گو مفید ہوتا لیکن اس مدت کے اندر لوگ اس کو بھول بھال جاتے اور اتنی ہم نے ان کی مخالفت بھی کرلی کہ وہ لوگ تو بارہویں کا انتظار کرتے ہیں۔ ہم کو اتنا صبر کہاں تھا۔ ہم نے اس ماہ کے شروع ہوتے ہی پہلے ہی جمعہ کو بیان شروع کر دیا۔ اِس مخالفت کرنے سے اب ہم پر کچھ شبہ نہیں ہوسکتا۔ ہم نے یہاں بھی اہل بدعت کی مخالفت کرلی۔ اس کے بعد تو اگر ہم واقعات اور قصص بھی ہم بیان کرتے تو کچھ حرج نہ تھا۔ لیکن ہمارے بیان کا زیادہ تر مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا راز بغرض تنبیہ اور اصلاح دین ہوتا ہے اس لیے شبہ کی بھی کوئی بات نہیں۔

(الظہور ملحقہ مجمع البدعۃ ص۶۹)

(اسی لیئے) چند سال سے میرا معمول ہے کہ ماہ ربیع الاول کے شروع میں ایک وعظ اس ماہ میں افراط وتفریط کرنے والوں کی اصلاح کے متعلق کہا کرتا ہوں اور اس میں طبعاً واستطراداً فوائد علمیہ ونکات وحقائق کا بھی بیان آجاتا ہے۔

(وعظ السرور ص۲)

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر ولادت کے متعلق لوگوں میں آج کل بہت سے منکرات اور اختراعات شائع ہوگئے ہیں جن سے عملاً واعتقاداً لوگوں کی حالت خراب ہوگئی ہے اور ان منکرات کا ارتکاب اسی مہینہ میں اکثر کیا جاتا ہے اس لیے بھی اس وقت یہ مضمون اختیار کیا گیا ہے تاکہ یہ بتلا دیا جائے کہ شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں پس اس وقت کے ذکر کی بنا ربیع الاول کی تخصیص نہیں (بلکہ منکرات پر نکیر کرنا اصل بنا ہے) (مجمع البدعۃ ص۳۱)

....

خاص طور پر بارہ ۱۲ ربیع الاوّل میں جلسہ اور تقریر۔

آج بارہ ربیع الاوّل ہے اسی تاریخ میں لوگ افراط و تفریط کرتے ہیں تو اس تاریخ کا بالتخصیص ارادہ نہیں کیا گیا اور نہ نعوذ باللہ اس تاریخ سے ضد ہے بلکہ الحمدللہ ہم اس میں برکت کے قائل ہیں۔ بس یہ تاریخ اگرچہ بابرکت ہے لیکن چونکہ اس کی تخصیص اور اس میں ذکر کا التزام کرنا بدعت ہے۔ اس لیے اس تاریخ کی تخصیص کو ترک کر دیں گے۔

اگرچہ اس یوم (بارہ ربیع الاوّل) میں افراط تفریط کے متعلق بیان کرنا زائد معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جو افراط تفریط کرنا تھا آج ان لوگوں نے کیا کر لیا ہوگا اب بیان سے کیا فائدہ مگر یہ ایام پھر بھی انشاء اللہ تعالیٰ آنے والے ہیں اور نیز ربیع الاوّل کے علاوہ اور دنوں میں بھی لوگ ایسی مجلسیں منعقد کرتے ہیں اور اس میں حدود شرعیہ سے متجاوز ہوتے ہیں اس لیے اس کے متعلق بیان کر دینا نفع سے خالی نہیں۔

(ماخوذ السرور ملحقہ مجمع البحور ص۱۱)

(خلاصہ یہ کہ) اصل میں اجتماع (یعنی جلسہ اور تقریر) احکام سننے کے لئے ہو اور اس میں یہ مبارک واقعہ اور فضائل نبوی کا بھی بیان ہو جائے یہ صورت بلانکیر جائز ہے بلکہ مستحب اور سنت ہے۔ (اصلاح الرسوم ص۸۴)

گجنیر کا مختصر واقعہ۔

ایک مرتبہ حضرت کانپور تشریف لے گئے وہاں معلوم ہوا کہ مقام گجنیر میں کچھ لوگ مرتد ہونے والے ہیں اس کو سنتے ہی حضرت نے وہاں

تشریف لے جانے کا عزم فرمالیا اور کھانے پینے کے سامان کے علاوہ خیمہ وڈیرہ وغیرہ کا تمام سامان ساتھ کرلیا لوگوں کو اس کی اطلاع ہو گئی تو اچھا خاصا مجمع ساتھ ہوگیا وہاں پہنچ کر حضرت والا نے ان کے ممتاز لوگوں سے گفتگو کرنا مناسب فرمایا تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان کے سردار دو شخص ہیں نھو سنگھ اور ادھار سنگھ ان دونوں کو نیچے لبعد دیگرے بلا لیا گیا کہ دونوں کے خیال آزادی سے معلوم ہوسکیں۔ گرمی کا زمانہ تھا اس واسطے ان کو شربت پلانا چاہا مگر انہوں نے عذر کردیا کہ ہم مسلمانوں کے ہاتھ کا نہیں کھایا پیا کرتے اور بھی بیہودہ رسمیں معلوم ہوئیں سر پہ چوٹی بھی تھی اور جہالت کی یہ حالت کہ ان سے پوچھا کہ تم ہندو ہو؟ کہا نہیں۔ دریافت کیا مسلمان ہو؟ جواب دیا نہیں۔ کہا گیا آخر کون ہو؟ بتلایا کہ نو مسلم ہیں۔

گفتگو کرنے پر نھو خاں نے تو خیال ظاہر کیا کہ آریہ مذہب میں نیوگ کا ایسا گندہ حکم ہے کہ کوئی بھلا مانس اس کو سننے کے بعد ہرگز اس مذہب میں داخل ہونا گوارہ نہیں کرسکتا اور ادھار خاں نے کہا کہ ہم تو تعزیہ بناتے ہیں ہم ہندو کیوں بننے لگے۔

حضرت اقدس نے ارشاد فرمایا کہ تعزیہ ضرور بنایا کرو بعض ہمراہیوں نے اس پر اشکال بھی کیا مگر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ان کے لئے بدعت وقایہ (بچنے کا ذریعہ) ہے کفر سے۔ اس لیے ان کو اس سے منع کرنا مصلحت نہیں۔

اس کے بعد عام مجمع میں بیانات بھی ہوئے۔ وہاں کے لوگوں کی سمجھ کے مناسب حضرت والا نے اعلان کے لئے یہ الفاظ تجویز فرمائے تھے کہ مسلمانوں کی کتھا ہوگی۔ اور بیان کے لئے ذکر میلاد شریف تجویز فرمایا تھا شیرینی بھی تقسیم کرائی تھی۔ مگر یہ سب کچھ مقامی رعایت کے سبب تجویز فرمایا تھا لیکن خود حضرت والا نے اس مجلس میں شرکت نہیں فرمائی بلکہ بعض ایسے صاحبان بھی ہمراہ تھے جو ایسی محفل کیا کرتے تھے ان سے میلاد شریف پڑھوا

دی۔ وہاں کئی دن قیام رہا اور جب انہوں نے خوب اچھی طرح وعدہ کر لیا کہ ہم مرتد نہ ہوں گے تب واپسی ہوئی۔ گو بیوقوفی سے ساتھ میں یہ بھی کہا تھا کہ ہم تمہارے جیسے مسلمان نہ ہوں گے بلکہ ایسے ہی نومسلم رہیں گے۔
(اشرف السوانح ص۲۳۱ ج ۳)

واقعہ گجنیر کی کچھ تفصیل۔

میں ایک دفعہ کانپور گیا تھا تو مجھے معلوم ہوا تھا کہ کانپور کے اطراف کے بعض دیہات میں نومسلم راجپوت مرتد ہونے والے ہیں۔ آریہ ان کو بہکا رہے ہیں تو میں نے اپنے احباب میں سے کچھ علماء اور رؤسار کو ساتھ لیا اور گجنیر میں قیام کیا جو سب دیہاتوں میں بڑا گاؤں تھا پھر وہاں سے دو دو تین تین عالموں کو متفرق دیہات میں تبلیغ کے لئے بھیج دیا اور ان کے چودھریوں کو بلایا۔ حالت ان کی یہ تھی کہ ان کے نام ہندوؤں جیسے تھے چنانچہ ایک چودھری کا نام تھنوسنگھ تھا اور دوسرے چودھری کا نام ادھار سنگھ تھا میں نے کہا کہ بھائی ہم نے یہ سنا ہے کہ تم آریہ ہونے والے ہو اگر اسلام میں کوئی شبہ ہو، دور کر لو۔ ایک نے جواب دیا کہ ہم آریہ کیوں ہوتے ان کے یہاں تو نیوگ کا بڑا فحش (گندہ) طریقہ ہے جسے کوئی شریف آدمی ہرگز گوارہ نہیں کر سکتا۔ پھر ہم نے کہا کہ ہاں بھئی بس تم مسلمان ہی رہنا۔ وہ کہنے لگے کہ ہم مسلمان بھی نہیں ہوتے ہم تو نومسلم ہی اچھے رہیں گے۔ میں نے کہا اچھا تم نومسلم ہی رہو۔

پھر باتوں باتوں میں ان سے پوچھا گیا اور بڑے چودھری سے کہا گیا کہ تجھے کلمہ بھی آتا ہے؟ کہنے لگا ہاں آتا ہے۔ کہا گیا سناؤ۔ کہنے لگا بس سنو مت گاؤں کے لوگ یوں کہیں گے کہ بڈھا سٹھیا گیا جو کلمہ پڑھت ہے۔

ان کو کلمہ پڑھنے سے بھی رکاوٹ تھی وہ ایسے مسلمان تھے بس چند باتیں اسلام کی ان کے اندر موجود تھیں ایک تو ختنہ کراتے تھے دوسرے مُردوں کو دفن کرتے تھے۔ تیسرے نکاح قاضی سے پڑھواتے تھے، مگر ساتھ ہی مندروں کی طرح پھیرے بھی کرتے تھے اور ایک بات اُن میں اسلام کی (ان کے خیال کے مطابق) یہ بھی کہ محرم میں تعزیہ بناتے تھے اور اس کو اتنا بڑا شعار سمجھتے تھے۔ کہ ادھار سنگھ نے یوں کہا تھا کہ ہم آریہ کیسے بنت ہمارے یہاں تو تاجیہ (تعزیہ) بنت ہے۔ میں نے یہ سُن کر کہا کہ دیکھو تعزیہ مت چھوڑنا۔ کہنے لگے اجی بھلا اسے ہم کب چھوڑنے لگے۔

بعض علماء کو میری اس بات پر خیال ہوا کہ اس نے مسلمانوں کو ایک بدعت کی اجازت دے دی۔ میں نے کہا بس چپکے بیٹھے رہو۔ یہ کانپور اور لکھنؤ میں ہی شرک و بدعت ہے مگر یہاں فرض ہے کیونکہ اس جگہ تعزیہ ہی ان لوگوں کے دین کا وقایہ (بچانے کا ذریعہ) ہے۔

ابھی تو ان لوگوں کا تعزیہ بناتے رہنا ہی ان کے اسلام کا محافظ ہے پھر رفتہ رفتہ بہ پکے مسلمان ہو جائیں گے اس وقت سنت و بدعت کی تعلیم دے دینا۔

ہمارے ایک دوست نے عجیب بات کہی میں نے ان سے کہا کہ کالج علی گڑھ میں میلاد شریف ہوا کرتا ہے جو کہ بدعت ہے وہ دوست فرمانے لگے کہ یہ میلاد شریف اور جگہ تو بدعت ہے مگر کالج میں جائز بلکہ واجب ہے۔ کیونکہ اس بہانے سے کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف اور آپ کے فضائل اور معجزات سن لیتے ہیں تو اچھی بات ہے۔ اسی طرح حضورؐ کی عظمت و محبت ان کے دلوں میں قائم رہے۔ ورنہ وہ تو سال بھر ایسی خرافات میں مبتلا رہتے ہیں کہ بھول کر بھی خدا اور رسُول کا نام ان کی زبان پر نہیں آتا۔ مجھے تو ان کی یہ بات پسند آئی کیونکہ واقعی اگر کسی جگہ

بدعت ہی لوگوں کے دین کی حفاظت کا ذریعہ ہو جائے تو وہاں اس بدعت کو غنیمت سمجھنا چاہیئے جب تک کہ ان کی پوری اصلاح نہ ہو جائے۔

بدعت یا میلاد جیسے جلسوں میں جانا چاہیئے یا نہیں

اگر کسی جگہ بدعت ہی لوگوں کی دین کی حفاظت کا ذریعہ ہو جائے تو وہاں بدعت کو غنیمت سمجھنا چاہیئے جب تک کہ ان کی پوری اصلاح نہ ہو جائے۔ جیسے معروف ہیئت کے ساتھ میلاد شریف اور جگہ تو بدعت ہے مگر کالج میں جائز بلکہ واجب ہے۔ کیونکہ اس بہانے سے وہ کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف اور آپؐ کے فضائل و معجزات تو سن لیتے ہیں تو اچھا ہے اسی طرح حضورؐ کی عظمت و محبت ان کے دلوں میں قائم رہے۔
اصل میں تخصیص اعتقادی ناجائز ہے اور تخصیص عملی بوجہ تشبہ کے ناجائز ہے
(خیر الارشاد حقوق العباد ملحقہ حقوق و فرائض ص۲۶)
مگر تخصیص اعتقادی کے برابر نہیں تو اگر کوئی شخص محض تخصیص عملی میں مبتلا ہو۔ اور اس کا اعتقاد درست ہو تو اس سے الجھنا نہیں چاہیئے اور جو دونوں میں مبتلا ہو اس کے اعتقاد کی اصلاح کر دینی چاہیئے اور مولود خواں پر فوراً بدگمان نہ ہونا چاہیئے ممکن ہے کہ اعتقاد درست ہو اور رسولؐ کی محبت کی وجہ سے تخصیص عملی میں مبتلا ہو جس میں کسی قدر وہ معذور ہو۔ (انفاس عیسیٰ ص۳۵۹)

محفل میلاد کے متعلق حضرت گنگوہیؒ و حضرت تھانویؒ کا اختلاف۔

محفل میلاد کے متعلق پہلے میرا یہ خیال تھا کہ اس محفل کا اصل کام

ذکرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو سب کے نزدیک خیر و سعادت اور مستحب بھی ہے البتہ اس میں جو منکرات اور غلط رسمیں شامل کر دی گئی ہیں ان کے ازالہ (ختم) کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اصل امر محفل مستحب کو ترک نہیں کرنا چاہیئے۔ دراصل حضرت حاجی صاحب کا یہ مسلک تھا اور حضرت کی غایت شفقت و عنایت و محبت کے سبب میرا بھی ذوق یہی تھا۔ اور حضرت گنگوہیؒ رحمتہ اللہ علیہ اسی مسلک حنفی کے پابند تھے (جس کا ذکر ماقبل میں ہوا) یعنی یہ کہ جو مباح یا مستحب مقاصدِ شرعیہ میں سے ہو اس کے ساتھ تو یہ معاملہ کرنا چاہیئے کہ اگر اس میں کچھ منکرات شامل ہو جائیں تو اس کی وجہ سے جماعت چھوڑ دینا جائز نہیں۔

لیکن جو مستحبات ایسے ہیں کہ اصل مقاصدِ شرعیہ ان پر موقوف نہیں اگر ان میں کچھ منکرات و بدعات شامل ہو جائیں تو ایسے مستحبات ہی کو ترک کر دینا چاہیئے مثلاً زیارتِ قبور۔ ذکرِ رسولؐ کے لئے کسی محفل و مجلس کا انعقاد کہ اس پر کوئی مقصدِ شرعی موقوف نہیں۔ وہ بغیر اس مجلس اور خاص صورت کے بھی پورے ہو سکتے ہیں۔ اگر ان میں منکرات و بدعات شامل ہو جائیں۔ تو یہاں ایسی مجلس اور ایسے اجتماعات ہی کو ترک کر دیا جاتا ہے۔

اس کے دلائل و شواہد کو علامہ شاطبیؒ نے کتاب "الاعتصام" میں جمع فرما دیا ہے۔

حضرت گنگوہیؒ رحمتہ اللہ علیہ اسی مسلک کے پابند تھے اس لئے مروجہ محفل میلاد جو بہت سے منکرات و بدعات پر مشتمل ہو گئی ہے اس کی شرکت کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

کچھ زمانہ تک اس مسئلہ میں حضرت گنگوہیؒ سے میرا اختلاف رہا ہے بالآخر دلائل کی قوت اور دین کی حفاظت کے پیش نظر یہی مسلک احوط و اسلم نظر آیا۔ اسی کو اختیار کیا لیکن جو مسلک صوفیائے کرام نے اختیار فرمایا

ہے۔ میں اس کو بھی بے اصل نہیں جانتا۔ فقہاء مجتہدین میں سے حضرات شافعیہ کا بھی یہی مسلک ہے اور علامہ شامیؒ نے مصافحہ بعد الصلوٰۃ کے مسئلہ میں شیخ محی الدین نووی شافعیؒ کا یہی مسلک نقل کیا ہے اس لیے جو صوفیاء کرام محفل میلاد خالی از منکرات پر عامل ہیں ان پر بھی اعتراض اور بدگمانی نہیں کرنا چاہیئے۔ (مجالس حکیم الامت ص۱۶۱ و ص۱۶۲)

حضرتؒ کا نظریہ و مختار مسلک۔

اگر کسی جگہ ایسی میلاد میں پھنس جائیں جہاں قیام ہوتا ہو تو یہ اس مجلس میں مجمع کی مخالفت نہ کریں بلکہ قیام کرلیا کریں کیونکہ ایسے مجمع میں ایک دو کا قیام نہ کرنا فساد کا ذریعہ ہے۔ ہاں جہاں ہر طرح اپنا اختیار ہو وہاں تمام قیود کو حذف کر دیا جائے ایسے موقع میں خاموش رہنا گناہ ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص۳۶)

لیکن یہ صورۃً اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ مجلس میں موجود ہو اور قیام نہ کرے یا تو آدمی جائے نہیں اور اگر جائے اور قیام نہ کرے یہ صورت اچھی نہیں۔ ایسے موقعہ پر قیام کرے۔ (حسن العزیز سوم ص۱۵۵)

کانپور کے قیام کے زمانے میں۔ (میرے اندر) جب نرمی آئی تو قیام کرنے لگا لیکن کبھی کرتا اور کبھی نہیں کرتا۔ مجھ کو اس سے عوام کی اصلاح کی توقع تھی۔ مگر (تجربہ) سے معلوم ہوا کہ لوگ یہ طمع کرتے لگے کہ یہی بالکل ہمارے موافق ہو جائے۔ (لہٰذا) اخیر میں میں نے بالکل ترک کردیا۔ اور دوبارہ پھر مجھ سے مخالفت ہوئی۔

ماہِ محرّم کے جلسے اور اس میں قصہ شہادت کا بیان

سوال: ہمارے یہاں کے کے پہلے عشرہ میں وعظ کی مجلس ہوتی ہے۔ اکثر پانچ چھ تاریخ سے وعظ شروع ہوتا ہے۔ واعظین اول تو قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ اور ان کے ضمن میں دیگر واقعات اور حالات بھی بیان کرتے ہیں۔ اور ہر طرح سے شرعی منکرات اور بُرے افعال سے لوگوں کو آگاہ کر کے اس سے بچنے کی سخت تاکید کرتے ہیں بعدہٗ عناصر شہادتین ابتدار سے پڑھنا شروع کرتے ہیں اور ابتدار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امراض و وفات کے حالات و واقعات بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کا ہوتا ہے اس کے خلفائے اربعہ جیسے ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم کا ذکر ہوتا ہے پھر امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے خاندان کی شہادت کا ذکر ہوتا ہے پھر امام حسینؓ کی شہادت کا بیان غرضیکہ اسے تھوڑا تھوڑا پڑھ کر پانچ سے دس تاریخ تک پڑھ کر اسے حاضرین مجلس کو سناتے ہیں۔

اور یہاں مسلمان اور ہندوؤں میں تعزیہ داری بکثرت ہے نیز کھیل تماشے ناچ وغیرہ طرح طرح کی رنگ رنگیلیاں ہوتی ہیں اور طرح طرح کے بدعات ہوتے ہیں اکثر مسلمان تعزیہ دیکھنے کے لئے ان مزخرفات و خرافات کے مرتکب ہوتے ہیں غرض پہلے عشرہ محرم میں نہایت بری حالت ہوتی ہے۔

اس لئے بانیٔ مجلس کی یہ غرض ہوتی ہے کہ وعظ کی مجلس قرار پائے تاکہ سامعین آئیں اور وعظ و نصیحت سنیں اس مجلس وعظ میں تعزیہ دیکھنا پنجہ اور علم کا اٹھانا اور اس پر کھچڑا وغیرہ لے جانا اور اس کے علاوہ محرم کے جس قدر بدعات ہیں ان سب سے وہ منع کرتے ہیں اور یہ مجلس کئی جگہ ہوتی ہے ان کا یہ خیال ہے کہ مجلسِ وعظ قائم کی جائے تاکہ اکثر مسلمان ان خرافات

اور واہیات سے بچیں اور وہاں نہ جائیں اور بفضلِ خدا اس کی وجہ سے بہت لوگ وہاں جاتے بھی نہیں لہٰذا پوچھنا یہ ہے کہ جب اس مجلس کے تقرر سے بانی مجلس کی منشاء اور غرض یہی ہے کہ جب تک مجلس ختم نہ ہو تب تک لوگ گناہوں سے بچتے رہیں۔ لہٰذا ایسی مجلس کا قرار دینا درست ہے یا نہیں؟ اگر یہ برخاست ہوگئی تو پھر دو تین گھڑی تک جو لوگ گناہ سے بچ رہے ہیں نہ بچیں گے۔ یہ بہتر ہے یا مجلس قرار دینا بہتر ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب شہادت امام حسینؓ وغیرہ کا بیان کرنا درست نہیں اور تعزیہ وغیرہ بھی دیکھنا درست نہیں تو دونوں یکساں ٹھہرے۔ لہٰذا زید کہتا ہے کہ شہادت کا بیان کرنا حرام ہے اور دلیل میں تشبہ بالروافض کو پیش کرتا ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ امام حسینؓ کا فوت ہونے کا غم اب تک کیوں؟ جس دن شہید ہوئے اس کے تین دن بعد سے اب غم نہیں کرنا چاہیئے جیسے کہ سوگ کرنا کسی کے مرنے کے تین دن سے زیادہ حرام ہے اسی طرح امام حسینؓ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی تین دن سے زیادہ حرام ہے کیونکہ اب تو تیرہ سو برس گذر گئے۔ اب کہاں سوگ و غم۔ تو کیا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے؟

اور یہ بھی کہ کیا امام حسینؓ ہی کی شہادت بیان کرنا جائز ہے یا اور بھی کسی کی۔ یا یہ خصوصیت عشرۂ محرم کی وجہ سے نادرست ہوگیا یا کیا ہے؟

اگر ایسا ہے تو بے موقع اور بے محل کسی چیز کا بیان کرنا بھی اچھا معلوم نہیں ہوتا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا حال ربیع الاول میں نہ پڑھا گیا کسی دوسرے ماہ میں ہوا تو یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔

اور اگر کسی خاص ایام کی وجہ سے اس کا بیان کرنا درست نہیں تو پھر پنجوقتہ نماز معینہ اور خاص پہلی تاریخ عید کے دن۔ اور دس تاریخ

کو بقرعید و محرم۔ اور شادی بیاہ جس کے لئے وقت مقرر ہے اور ہوتا ہے سب کے سب نادرست ہوں گے ان کا بھی دوسرے وقت میں کرنا واجب ہے۔ غرضیکہ کئی اعتراض پیدا ہوتے ہیں گذارش ہے کہ سب کا جواب جداگانہ تحریر فرمائیں۔

الجواب :۔ تشبیہ بالروافض جیسے پکار و نوحہ (رونے اور ماتم کرنے) میں ہے۔ ایسے ہی تخصیص عاشورہ میں بھی ہے۔ بلکہ ایسی تخصیص خود بھی بدعت ہے۔ اگرچہ اس میں تشبہ بھی نہ ہو اور اس تخصیص کا قیاس نماز کے اوقات وغیرہ کی تخصیص پر یا بیاہ شادی کی تاریخ کی تعین پر قیاس مع الفارق ہے اول مقیس علیہ میں تو تخصیص خود شارع سے منصوص ہے تو اس کے ساتھ تخصیص من غیر الشارع (شارع کے علاوہ کی تخصیص) کیسے ملحق ہو سکتی ہے اور دوسرے مقیس علیہ میں تخصیص کو (یعنی شادی کی تعین کو) کوئی شخص دین نہیں سمجھتا اور اس کو دین سمجھتے ہیں۔ اور مباح کو جزء دین سمجھنا خود بدعت ہے اور تخصیص کی توجیہ میں یہ کہنا کہ بے محل بیان کرنا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا عجیب (بات) ہے۔ اور فی الواقع شارع علیہ السلام پر اعتراض ہے کہ مطلق کو مقید کیوں نہیں کیا کیونکہ اس مقید نہ کرنے سے یہی بے محل واقع ہونا لازم آئے گا جس کو مدعی بے محل بتلا رہے ہیں۔ رہی یہ مصلحت کہ اس مجلس کی وجہ سے عوام جہلا منہیات (و منکرات) سے رکتے ہیں۔ اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ ایک معصیت کو اس لیے اختیار کیا جائے تاکہ دوسرے معاصی سے حفاظت رہے تو اس مصلحت سے بدعت کا ارتکاب کرنا جائز نہیں ہو سکتا۔

دوسرے یہ مصلحت اس سے بھی تو حاصل ہو سکتی ہے کہ دوسرے مضامین حکمیہ کا وعظ ہوا کرے۔ جس میں منکرات و مفاسد کی اصلاح کا بیان ہو۔ اور یہ قصے اصلاً مذکور نہ ہوں اور اگر یہ شبہ ہو کہ اس میں کوئی نہ آئے گا یا کم آئیں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فعل آنے والوں کا ہے۔ واعظ یا

بانی مجلس کو اس کی کیا فکر یہ اپنی طرف سے مفاسد کے انسداد کی کوشش کرے آگے خواہ اثر مرتب ہو یا نہ ہو۔

تیسرے اگر عوام کے مذاق کی ایسی ہی رعایت کی جائے تو ان کی جتنی قبیح رسمیں ہیں ہرایک کے مقابل وہی رسم اصلاح کر کے منعقد کرنا جائز ہوگا۔ تو تعزیہ و علم کی بھی کسی قدر اصلاح کرکے اجازت ہونا چاہیئے۔ اور اصلاح یہ ہو سکتی ہے۔ کہ تعزیہ کی پرستش اور اس پر چڑھاوا اور معازف ر باجے) وغیرہ نہ ہوں۔ صرف مکان کی تصویر ہو۔ اس کے ساتھ مباح اشعار ہوں۔ اور مباح دف ہو۔ علیٰ ہذا (اسی طرح) تمام رسوم میں ایسا ہی کر سکتا ہے۔

اور بعض کتب میں ایسے شخص کو اجازت دینا جو کہ اور بھی بیان کرے یہ صرف رفع ہے ایک مانع جواز کا۔ اور وہ مانع مضمون کی تخصیص ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اگر دوسرے موانع بھی ہوں تب بھی جواز کا حکم ہوگا۔ سو ایک مانع خود تخصیص زمانہ کی بھی ہے۔ کما ذکر غرض میرے نزدیک اصول فقہ کا مقتضیٰ اس مجلس کا فوراً موقوف کردینا ہے۔ واللہ اعلم۔

(امداد الفتاویٰ ص۳۲ ج ۵۔ سوال ۲۸۹)

شیعوں کے مقابلہ میں مدح صحابہ کے جلسے کرنا۔

روافض کی تبرا گوئی کے مقابلہ میں لکھنؤ کے بعض علماء نے مدح صحابہ کی مجلسیں جاری کی تھیں جس کے نتیجہ میں روافض کی تبرا گوئی اور تیز ہوگئی۔ اس کے متعلق بعض حضرات نے حضرت سے سوال کیا تو حضرتؒ نے ان کو جواب لکھا جس کا خلاصہ بطور یادداشت کے ایک پرچہ پر لکھا ہوا تھا جس کی نقل یہ ہے۔

الجواب: ۔ روی البخاری بسندہ عن ابن عباس فی قولہ

تعالیٰ ولا تجهر بصلوتك ولا تخافت بها قال نزلت ورسول الله صلی الله علیه وسلم مختف بمكة كان اذا صلی باصحابه رفع صوته بالقرآن فاذا سمع المشركون سبّوا القرآن ومن انزله ومن جاء به فقال الله تعالیٰ لنبيّه صلی الله علیه وسلم ولا تجهر بصلاتك ای بقراءتك فيسمع المشركون فيسبوا القرآن ولا تخافت بها من اصحابك فلا تسمعهم وابتغ بين ذلك سبيلا۔

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ خود قرآن کا جہر اور وہ بھی جماعت کی نماز میں کہ امام پر واجب ہے اگر سبب بن جائے قرآن کے سبّ وشتم (بُرا بھلا کہنے کا) تو ایسے وقت میں اتنے جہر کی ممانعت ہے کہ سبّ وشتم کرنے والوں کے کان میں آواز پہنچ جائے تو مدح صحابہ کا اعلان وجہر جو کہ فی نفسہٖ واجب بھی نہیں اگر سبب بن جائے صحابہ کے سبّ وشتم کا تو ایسے وقت اس کا اتنا جہر کر سبّ وشتم کرنے والوں کے کان میں آواز پہنچے کیسے ممنوع نہ ہوگا۔ ويؤيده ويزيل بعض الاشكالات الواردة عليه ما فی روح المعانی تحت قوله تعالیٰ ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله الاية ۔ (روح المعانی ص۲۱۹، مجالس حکیم الامت ص۳۱۲ مطبوعہ دہلی)

ایک صاحب علم کی بابت فرمایا کہ وہ جونپور میں سرِراہ میں اور بالخصوص محرم میں وعظ کیا کرتے تھے اور اس کی حکمت یہ بتلاتے تھے کہ میں اس لیے کرتا ہوں تاکہ لوگ شیعوں کی مجلس میں نہ جائیں۔

ایک غیر مقلد مولوی صاحب نے جواب دیا کہ اگر ایسا ہی ہے تو ہندوؤں کی ہولی اور دیوالی بھی [illegible]ت سے کرنی چاہیئے تاکہ لوگ ان کے مجمعوں میں نہ جائیں ۔ (حسن العزیز ص۲۲۹ ج ۲)

۳ جمادی الثانی ۱۴۲۲
۲۴-۸-۰۱

رجبی جلسوں کا شرعی حکم

سوال:۔ چند سال سے ہندوستان کے کئی مقامات میں رجبی جلسے شروع ہونے لگے ہیں یعنی ۲۷ و ۲۸ رجب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا حال پڑھا جاتا ہے اور بڑا مجمع ہوتا ہے اور کثرت سے روشنی کا سامان فراہم ہوتا ہے اور بعض جگہ اسی مجلس میں معراج شریف کے بیان کے بعد قوالی بھی ہوتی ہے۔ براہِ مہربانی شریعت کی رُو سے مطلع فرمائیں کہ اس کا کرنے والا اور شریک ہونے والا اور مدد کرنے والا ثواب کا مستحق ہوگا یا عذاب کا۔

الجواب:۔ رجبی جلسہ بہیئت متعارفہ زمانہ ہذا (یعنی معروف ہیئت کے ساتھ اس زمانہ) میں جو منکرات جمع ہیں وہ ظاہر ہیں۔

التزام مالا یلزم جس کی کراہیت فقہاء کے کلام میں منصوص ہے اور بہت سے فروع فقہیہ کو اس پر متفرع کیا ہے۔

کثرتِ روشنی میں اسراف کا ہونا جس کی ممانعت قرآن پاک میں منصوص ہے۔

اس میں تداعی (یعنی ایک دوسرے کو بلانے کا) اہتمام جو تطوعات کے لئے مکروہ ہے جس کی بناء پر فقہاء نے نفل جماعت کو مکروہ کہا ہے۔

اور بھی جس قدر منکرات کو محققین نے میلاد کی معروف مجلسوں سے ذکر کیا ہے۔ اکثر بلکہ کچھ زیادتی کے ساتھ اس میں جمع ہیں۔ بالخصوص اگر اس کے ساتھ قوالی بھی ہو تو منکرات اور بڑھ جائیں گے۔

مذکورہ جوابات کی بناء پر مذکورہ جلسے کے داعی اور ساعی (کوشش کرنے والے) اور بانی و معین (مدد کرنے والے) اور شریک سب کے سب قابلِ ملامت و تشنیع ہوں گے۔ طالب حق کے لئے یہ مختصر (تحریر) کافی ہے اور مخاصم (جھگڑا کرنے والے کے لئے) دفتر کے دفتر ناکافی ہیں۔

(امداد الفتاویٰ صفحہ ۲۸۶ ج ۵ سوال ۲۵۷)

دینی مدارس میں دستار بندی اور سالانہ جلسے۔

سنیئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔

اس آیت میں اعمالِ خیر کی طرف رغبت دلانے اور دعوت دینے کا امر ہے۔ اور قرآن کے تعلیم وتعلم کا خیر الاعمال ہونا ثابت ہوچکا ہے۔ تو اس کی ترغیب دینا بھی ضروری ٹھہرا۔ اور ترغیب کی دو صورتیں ہیں ایک تو ان کی اعانت کرنا۔ ان کی خدمت کرنا۔ ان کی عزت وعظمت کرنا۔ اور ایک طریقہ وہ ہے جو بزرگوں نے اختیار کیا ہے کہ جو شخص قرآن سے فارغ ہو اس کو دستار بندی کی جائے اس سے بھی فارغ ہونے والوں کو مسرت ہونے کی وجہ سے قرآن کی تعلیم کی طرف اور ان کے سرپرستوں کو تعلیم قرآن کی طرف بہت رغبت ہوتی ہے۔ اور تعلیم کا سبب بن جانا یہ بھی ایک تعلیم کا مصداق ہے۔ پس یہ عمل خلاف سنت نہیں کیونکہ اعمالِ خیر کی رغبت دلانے کا نص میں حکم وارد ہے اور یہ بھی اسبابِ رغبت میں سے ہے پس صراحۃً تو نہیں مگر دلالۃً یہ بھی نص سے ثابت ہوا۔ (التبلیغ ص۲۴۵ ج۲۱)

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ (العلم والعلماء ص۲۳۲)

مدارس کے متعارفہ جلسوں کے بعض شرعی منکرات ومفاسد۔

موانع شرعیہ کا حاصل یہ ہے کہ جہاں تک غور کرکے اور تجربہ کی شہادت سے دیکھا جاتا ہے تو ان جلسوں کے منعقد کرنے کی بڑی غرض دو معلوم ہوتی

ہیں۔ فراہمی چندہ اور اپنی کارگذاری کی شہرت۔ یا۔ یوں کہئے کہ مدرسہ کی وقعت و رفعت جس کا حاصل حُبِ جاہ اور حبِ مال نکلتا ہے جس سے نصوص کثیرہ میں نہی فرمائی گئی ہے۔ اگرچہ مال و جاہ اگر دین کے لیے مقصود ہوں تو مذموم نہیں مگر کلام اس میں ہے کہ ایسے موقع پر یہ امور دین کے لئے مقصود ہیں یا دنیا کیلئے۔ سو گو نفس تاویل کرکے دین ہی کے لیے بتلاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے ہر قصد کے لئے ایک معیار بنایا ہے جس سے صحت یا فسادِ قصد معلوم ہو جاتا ہے۔ سو ان مواقع میں جہاں تک غور کیا جاتا ہے طلبِ دنیا کی علامت غالب معلوم ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر دین مقصود ہوتا تو اس کے اسباب وطریق میں کوئی امر خلافِ رضاءِ حق تعالیٰ اختیار نہ کیا جاتا۔ اور جب ایسے امور اختیار کئے جاتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیا مقصود ہے ان امور میں بطور نمونہ کے بعض درج ہیں۔

۱۔ اپنے مدرسہ کو اصلی حالت سے اکثر زیادہ ظاہر کیا جاتا ہے تصریحاً یا ایہاماً جس کا حاصل کذب و خداع (یعنی جھوٹ اور دھوکہ) دینا ہے۔

۲۔ طلباء کی زیادتی کو دکھلانے کے واسطے نااہلوں کو اہل دکھلایا جاتا ہے

۳۔ حکم شرعی ہے کہ ریا حرام ہے اور ایسے موقعوں پہ دینے والوں کے دلوں میں ریاء ہوتی ہے اور ریاء کا سبب بن جانا بھی معصیت ہے۔

۴۔ اگر کوئی شخص مدرسہ پر کسی قسم کا اعتراض کرے اور وہ صحیح بھی ہو تو بھی ہرگز اس کو قبول نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس کے درپے ہو کر رد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے گو دل میں اس کو حق سمجھتے ہیں جس کا حاصل بطرِ حق ہے (یعنی حق سے تکبر کرنا۔)

۵۔ اکثر ایسے جلسوں میں اسراف ہوتا ہے جن لوگوں کو بلانے کی ضرورت نہیں ان کے اور ان کے رفقاء وخدام کے کرایہ میں بہت سے روپے جاتے ہیں۔ بعض اوقات طعام وغیرہ کا بھی اہتمام مدرسہ سے ہوتا ہے جن میں تکلفات

ہوتے ہیں اور ساتھ میں غیر مہمان بھی کھاتے ہیں اور غالباً بلکہ یقیناً روپے (چندہ) دینے والوں سے اجازت نہیں لی جاتی (پھر یہ کیسے جائز ہوگا)۔

۶۔ بعض جگہ مسجد میں ایسے جلسے ہوتے ہیں جس میں شور و شغب / دنیا کی باتیں اشعار مذمومہ اور بہت سے منکرات ہوتے ہیں جو مشاہدہ سے متعلق ہیں۔

۷۔ چندہ حاصل کرنے میں قواعد شرعیہ کی رعایت نہیں کی جاتی۔

(امداد الفتاویٰ ص۲۴۳ ج۴)

مجلسِ وعظ میں اگر منکرات و مفاسد شامل ہوں تو اس کی وجہ سے مجلسِ وعظ کو ترک نہ کیا جائے گا بلکہ مفاسد کی اصلاح کی جائے گی۔

قاعدہ شرعیہ ہے کہ جس عمل میں مفاسد غالب ہوں اگر وہ عمل غیر مطلوب ہو تو نفسِ عمل سے منع کر دیا جاتا ہے اور اگر مطلوب ہو تو عمل سے منع نہیں کیا جاتا بلکہ اِن مفاسد کا انسداد کر دیا جاتا ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص۲۸۳ ج۴)

وہ (عمل)، اگر خود شرعاً ضروری ہے تو اس فعل کو ترک نہ کریں گے بلکہ اس میں جو مفاسد پیدا ہو گئے ہیں ان کی اصلاح کر دی جائے گی مثلاً جنازہ کے ساتھ کوئی نوحہ کرنے والی عورت ہو تو اس کو اس مکروہ کے اقتران (شامل ہو جانے کی) وجہ سے جنازہ کے ہمراہ جانا ترک نہ کریں گے خود اس نوحہ کو منع کریں گے کیونکہ وہ ضروری امر ہے اس عارضی کراہیت کی وجہ سے اس کو ترک نہ کیا جائے گا۔ علامہ شامیؒ نے (تصریح فرمائی ہے)۔ (اصلاح الرسوم، ص۱۱۰)

قاعدہ فقیہہ ہے کہ خواص کا جو فعل غیر ضروری عوام کے مفسدہ کا سبب

بن جائے اس کو منع کیا جائے گا بخلاف مجلس وعظ کے وہ فی نفسہٖ ضروری ہے کہ وہاں مفاسد کا انسداد کریں گے خود اس کو ترک نہ کریں گے۔ فافترقا۔
(امداد الفتاویٰ ص۲۶۵ ج ۵)

فصل ۲ جلسہ جلوس میں سجاوٹ اور زیبائش ونمائش

اگر واقعی کوئی کام کرنا ہے تو کسی چیز میں شان وشوکت کا خیال مت کرو۔ اس وقت عام طور پر مجالس اسلامیہ کو آرائش وزیبائش سے بالکل تھیٹر بنادیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ غیر قوموں کے مقابلہ میں ہم کو ان سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔

اے حضرات! غیر قومیں کہ جن کے سامنے آپ یہ ظاہر کر رہے ہیں آپ ان کا مقابلہ اس میں نہیں کر سکتے۔ ان کے برابر دولت آپ کے پاس کہاں ہے اگر وہ بھی ضد باندھ لیں تو یقیناً آپ ان سے کے مقابلہ میں شرمندہ ہوں گے۔ اس لیے آپ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پیروی کیجئے اور کفار کا یہ نفسانی مقابلہ چھوڑ دیجئے۔

سلف کا طرز یہ تھا کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کو بیت المقدس کے نصاریٰ کے سامنے پیش کرنے کے لئے لے گئے آپ پھٹے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ عرض کیا گیا کہ لباس بدل لیجئے تاکہ کفار کی نظر میں عزت ہو۔ فرمایا "نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام" "ہم وہ قوم ہیں کہ خدا نے ہمیں اسلام سے عزت دی" لباس سے نہیں دی۔

جب بیت المقدس کے قریب پہنچے تو پھر سب نے اصرار کیا کہ جوڑا اور سواری بدل لیجئے۔ آپ نے مسلمانوں کا دل توڑنا گوارہ نہ کیا اور منظور فرمالیا ایک مانگے کا گھوڑا اور مانگے کا جوڑا لایا گیا۔ یہ امیر المومنین ہیں،

جن کے پاس ایک اچھا گھوڑا بھی نہ نکلا۔ اللہ اکبر! کیا سادگی تھی۔ خیر گھوڑے پر سوار ہو کر دو قدم چلے ہوں گے کہ گھوڑا نخرا اور ناز سے چل چل کر چلنے لگا آپ اسے روک کر فوراً اتر پڑے اور فرمایا تمہارا بھائی عمر ہلاک ہو گیا ہوتا کیونکہ گھوڑے پر بیٹھ کر وہ دل ہی نہیں رہا چنانچہ پھر اپنی پہلی ہی سادہ حالت میں پیش کئے گئے۔ نصاریٰ نے جب آپ کو دیکھا تو فوراً دروازہ کھول دیا۔ اللہ اکبر! یہ تھی خلوص اور سادگی کی برکت مسلمانوں کو اس حالت سے جھینپ نہ ہونی چاہیئے۔ صحابہ کے طرز کو دیکھئے مدینہ کی سادی مسجد میں ٹوٹے ہوئے بوریوں پر بیٹھے ہیں اور حوصلہ اس قدر بلند ہے کہ سلطنت روم و فارس کی قسمت کے فیصلے کا مشورہ کر رہے ہیں۔ حضرات یہ نمونہ تھا کام کرنے والوں کا یہ فیشن یہ وضع اور یہ شان و شوکت ان حضرات میں کہاں تھی۔

یہود اپنی زینتیں دکھلائیں نصاریٰ اپنی زینتیں دکھلائیں ہنود اپنی زینتیں دکھلائیں اور ایک مسلمان پھٹا ہوا کرتہ پہن کر نکلے گا تو خدا کی قسم سب کی رونقوں کو مات کر دے گا۔

ارے صاحب خدا نے آپ کو وہ حسن دیا ہے کہ آپ کو زینت کی حاجت ہی نہیں۔

ارے صاحب اسلامی جلسوں کے لئے یہ حسن اور شرف کیا کم ہے کہ وہ اسلام کی طرف حقیقی نسبت سے منسوب ہے اسلامی مجلس تو ایسی ہو کہ دور سے دیکھ کر خبر ہو جائے کہ یہ مجلس اسلامی ہے یہ کسی ناچ رنگ کی محفل یا تھیٹر کا اسٹیج نہیں ہے۔ باہر سے اسلامی مجلس بالکل سادہ ہو اندر پہنچو تو صحابہ کا رنگ جھلکتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ بازاری عورتوں کی طرح گلے میں پھولوں کے ہار پڑے ہوں۔ لباس نہایت پر تکلف اور ایک ایک چیز اور ہر ہر ادا سے رؤسا کا سا تجبر نمایاں ہو۔ اور حقیقت کا پتہ نہیں۔ اور مشاہدہ

شاہد ہے کہ زیب و زینت وہ شخص کرتا ہے جس کے پاس مال ہے کمال نہیں ورنہ یہ بجائے ملّی کے اپنے کمال کا اظہار کرتا اور اب کمال نہ ہونے سے مال کا اظہار کر رہا ہے۔

حضرت! میں بقسم کہتا ہوں کہ قلب میں اگر حقیقت ہے تو ظاہری آرائش سے نفرت ہو گی۔ اور حقیقت سے کورے ہیں تو ظاہری شان و شوکت سے اس کی لیپ و پوت کریں گے۔ مجالسِ اسلامیہ میں کیا بناؤ؟ اِسلام کی طرح مجالس اسلامیہ میں بھی سادگی ہونی چاہیئے۔

(اصلاح الیتامیٰ ص ۲۶۲)

مروّجہ جلسوں و انجمنوں کی بدحالی!

انجمنوں میں عموماً یہی افراط ہے کہ علماء پر مضامین کی فرمائش ہوتی ہے جس سے زیادہ مقصود اپنی انجمن کی شان کا ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ اس میں ایسے ایسے مضامین پر بحث ہوئی اور اسی اظہار شان کے لئے ایسا ہوتا ہے کہ اگر ضرورت ہوتی ہے دو کی تو بلاتے ہیں دس بیس کو اس سے محض شان و شوکت مقصود ہوتی ہے۔ تبلیغ مقصود نہیں۔

خوب سمجھ لیجئے کہ دین میں بڑی چیز خلوص ہے نہ کہ افتخار و اظہار۔ یہی وجہ ہے ہمارے اکثر کارناموں میں برکت نہیں۔

غرض انجمنوں میں بہت سے واعظین کا جمع کرنا یہ سب افتخار و نمود اظہار (ریاکاری و شہرت) کے لئے ہوتا ہے۔

اِس میں ایک غرض اور بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ کوئی کسی واعظ کو پسند کرتا ہے، کوئی کسی کو۔ سب کو جمع کر لو تاکہ ہر مذاق کے لوگ جمع ہوں اور جلسہ میں خوب رونق ہو۔ میں کہتا ہوں کہ آپ صحیح غرض

کے لئے جلسہ کر رہے ہیں تو آپ کو لوگوں کے اس مذاق کی رعایت کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی روپے تقسیم کر رہا ہے تو سائل خود بخود جمع ہوں گے اس اشتہار کی کیا ضرورت کہ جو روپیہ لینے آئے گا اسے مٹھائی بھی ملے گی معلوم ہوتا ہے کہ روپے جعلی ہیں اگر سودا کھرا ہے تو بغیر قافیہ اور سجع ملائے بک جائے گا ورنہ مقفیٰ اور مسجع عبارت بولنا پڑے گی۔ حضرت اپنا متاع خالص رکھیے۔ دیکھیے خود بخود خریدار آئیں گے۔

(اصلاح الیتامیٰ ص۳۳)

وعظ وتقریر میں تصنّع وتکلّف اور دورانِ وعظ اشعار پڑھنا۔

آج کل بناوٹ کی اتنی شدت ہے کہ وعظ تک میں بناوٹ ہوتی ہے۔ مضمون نہیں آتا تو اسے زبردستی بنا لیتے ہیں مقصود تو ہے شعر پڑھنا اس کے لئے مضمون کو ادھر ادھر سے گھیر گھار کر بس جھٹ سے شعر پڑھ دیا۔ بھلا زبردستی شعر کے لئے اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب چھچھورا پن ہے کہ ایک آدھا شعر یاد ہے تو اسے ظاہر کیسے کریں خواہ بے موقع ہی پڑھ دیں۔

کیا اسلام کا یہی طریقہ ہے؟ کیا تبلیغ اسی بناوٹ کے طرز سے ہوتی ہے؟ موقع پر کوئی شعر یاد آگیا پڑھ دیا نہیں یاد آیا جانے دو۔ یاد آگیا تو ایک وعظ میں دو سو شعر ہیں نہیں یاد آیا تو ایک بھی نہیں ہے۔ حق ایسی چیز نہیں کہ اس کی طرف کشش نہ ہو۔ اہل حق اور ملمع سازوں میں سے بھی فرق ہوتا ہے کہ ملمع سازوں کی آمد بڑی رنگین

ہوتی ہے اور اس میں بڑا زور شور ہوتا ہے مگر حاصل سوائے قافیہ بندی کے کچھ نہیں ہوتا اور اہل حق کے کلام میں ابتدا، تو بہت دھیمی ہوتی ہے مگر انتہا میں اس کے زور اور قوت کا خاص اثر ہوتا ہے۔ ابتدا ان کی ہلکی بارش کی طرح آہستہ آہستہ ہوتی ہے جو کہ قلب میں بارش کی طرح جذب ہو جاتی ہے اور اس کا انتہائی گلزار ہوتا ہے۔

اور ملمع ساز اپنا رنگ جمانے کے لئے ابتدا میں خوب شعر پڑھتے ہیں اور کہیں کہیں ڈھولک اور ہارمونیم سے مجلس وعظ کو گرم کیا جاتا ہے مضامین کے الفاظ بھی دلگداز ہوتے ہیں کہ اس وقت تو ذرا جوش پیدا ہو جاتا ہے پھر جہاں مجلس برخاست ہوئی اثر بھی تشریف لے گیا۔ اور جو ذرا سا باقی رہ گیا وہ دو چار روز کا مہمان ہوتا ہے۔ اور اہل حق کے کلام کا اثر پائیدار ہوتا ہے۔ مگر ان کا کلام رنگین نہیں ہوتا۔

(اصلاح الیتمیٰ ۲۶۵۔ ۳۶۶)

عورتوں کے مجمع میں گا کر اشعار پڑھنے سے احتیاط۔

اکثر واعظین عورتوں کے مجمع میں خوش الحانی سے اشعار پڑھتے ہیں یہ بالکل مصلحت دین کے خلاف ہے۔ البتہ اوقات فتنہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ سفر میں ایک غلام کو عورتوں کے سامنے اشعار پڑھنے سے روک دیا اور فرمایا تھا کہ رویدك یا انجشة لا تکسر القواریر (ارے انجشہ چھوڑ دو۔ یعنی خاموش رہو۔ شیشے نہ توڑو۔ یعنی عورتوں کے دلوں کو بے قابو نہ کرو۔ ورنہ وہ ٹوٹ جائیں گے۔)

تو اس زمانہ میں جب کہ سب پر تقویٰ غالب تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت نہیں دی تو آج کس کو اجازت ہو سکتی ہے۔ بالخصوص

جب کہ عورتیں یا لڑکے ہی پڑھنے والے ہوں۔ (دعوات عبدیت ص۱۲۶)

امردوں سے نعت پڑھوانا درست نہیں۔

اجنبی عورت (یا بڑی لڑکی) یا امرد مشتہی (خوبصورت لڑکا جس کی طرف اس کی خوبصورتی کی وجہ سے کشش و میلان ہو) ان سے گانا سننا یہ بھی ایک قسم کی بدکاری ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی لڑکے کی آواز سننے میں نفس کی شرکت ہو تو اس سے قرآن سننا بھی جائز نہیں۔

اکثر لوگ لڑکوں کو نعت و غزلیں یاد کرا دیتے ہیں (اور احتیاط نہیں کرتے) یہ بھی جائز نہیں۔ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر بے ریش (بے داڑھی) لڑکا مرغوب طبع ہو تو اس کی امامت بھی مکروہ ہے۔ تو جب امام بنا کر کھڑا کرنا جائز نہیں حالانکہ اللہ کا قرآن ہی پڑھے گا مگر فقہاء نے بلا ضرورت اس کی اجازت نہیں دی۔ (اسی پہ نعت خوانی کو قیاس کر لیجئے) سہ (دعوات عبدیت ص۱۲۶ ج ۹)

مسجد میں نعت و شعر خوانی جائز ہے یا نہیں۔

سوال: مسجد میں نعت پڑھوانے کی فرمائش کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نعت ہو رہی ہے تو کیا مسجد کے احترام کے خلاف ہے کیونکہ مسجد میں جب نعت شریف ہوتی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔ اگر کسی مکان میں نعت ہوتی ہے تو شوق سے سنتا ہوں۔

الجواب: جس نعت کا مضمون شرع کے خلاف نہ ہو وہ مسجد اور غیر مسجد دونوں میں جائز ہے۔ اور جس کا مضمون خلاف شرع ہو وہ دونوں جگہ ناجائز

ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مانع خارج سے موجود ہو تب بھی ناجائز ہے جیسے نظم کا موسیقی قواعد سے پڑھا جانا یا نعت خواں کا مشتہی ہونا۔ (امداد الفتاوی ص ۱۹۶ ج ۶)

شعر و شاعری جائز ہے یا نہیں۔

ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت کیا شاعری ناجائز ہے؟ فرمایا کہ ناجائز تو نہیں لیکن بعض شاعروں کے اکثر مضامین خلاف شریعت ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کے لئے بے شک ناجائز ہے۔

اسی طرح اگر غلو و انہماک زیادہ ہو جائے اس کو بھی منع کیا جائے گا۔ ایک شاعر صاحب تھے اگر نماز میں کوئی شعر ان کو یاد آجاتا تو نماز توڑ کر اس کو لکھ لیتے کسی نے کہا یہ کیا؟ کہا نماز کی تو قضا ہے مگر شعر کی قضا نہیں۔ اکثر جاہل شعراء کے یہاں تو اشعار میں تو کوئی حد نہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت ص ۳ ج ۲)

(۳۱۱) بزرگوں کے اشعار سے کسی مسئلہ پر استدلال کرنا درست نہیں۔

ارشاد فرمایا کہ میری یہ وصیت ہے کہ بزرگوں کے نظم و کلام سے کسی مسئلہ پر استدلال کرنا ہرگز مناسب نہیں کیونکہ شعر میں اکثر معانی الفاظ کے تابع ہو جاتے ہیں پہلے سے جو مسئلہ معلوم تھا اس پر اس کو منطبق کر لینا تو درست ہے لیکن اس سے کوئی مستقل مسئلہ نکالنا درست نہیں۔

(مجالس حکیم الامت ص ۱۸۵)

فصل ۳ ۔۔۔۔۔۔ متفرقات ۔۔۔۔۔

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی حکایت اور حضرت تھانویؒ کا فرمان۔

(۴۹) خلوص کی ایک حکایت یاد آئی مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے ایک مجمع میں وعظ فرمایا۔ وعظ فرما کر نکل رہے تھے کہ ایک شخص ملا اس نے عرض کیا حضرت میں (اتنی دُور سے آرہا ہوں اور میں) نے وعظ سنا ہی نہیں فرمایا اچھا پھر کہہ دوں گا سنو! چنانچہ پھر اکیلے ہی اس کے سامنے وعظ کہہ دیا۔ اللہ اکبر! کس قدر خلوص ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات جو کچھ کرتے تھے محض اللہ ہی واسطے کرتے تھے اس میں نفس کی آمیزش نہ ہوتی تھی۔

ہم تو اپنے ہی کو کہتے ہیں ہم سے اگر کوئی اس طرح درخواست کرے تو ہم پھر کبھی نہ کہیں گے بلکہ اگر مجمع کم ہو جب بھی دل نہیں لگتا۔

(التبلیغ ملحق حقوق و فرائض ص ۲۱۴)

شملہ کے جلسے میں حضرت تھانویؒ کے لباس پر ایک صاحب کا اشکال اور حضرت تھانویؒ کا جواب۔

ایک واقعہ یاد آیا کہ ہم بعض معززین کی درخواست پر شملہ گئے تو وہاں وعظ کا

اطلاق ہوا۔ کرنل عبدالحمید صاحب نے اپنے نام سے، علان کیا جس وقت میں وعظ کے لئے کھڑا ہوا۔ تو میرے کپڑے دیکھ کر بعض جینٹلمینوں نے کرنل صاحب سے کہا کہ تمہارے علمار کے کپڑے تو ایسے ہیں جیسے ابھی پاخانہ سے نکل کر آرہے ہوں۔ حالانکہ میں اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور جمعہ کا دن تھا اس لیے صاف بلکہ استری کے تھے۔ جگہ ہاں کرتہ لمبا تھا اور پاجامہ اونچا تھا یہ نہ تھا کہ کرتہ اونچا ہو اور پائجامہ ٹخنوں سے نیچا ہو۔ ان نوتعلیم یافتہ صاحب کو یہ لباس حقیر معلوم ہوا۔ کرنل صاحب نے ان سے کہا کہ ابھی اس بات کا جواب نہیں دینا چاہتا۔ وعظ ختم ہونے کے بعد پوچھنا اس وقت جواب دوں گا۔ چنانچہ وعظ ختم ہونے کے بعد کرنل صاحب منتظر رہے کہ اس اعتراض کا اعادہ کریں مگر وہ کچھ نہ بولے تب کرنل صاحب نے خود یاد دلایا کہ اب آپ کہئے کیا کہتے تھے کہنے لگے کچھ نہیں کہتا اور جو کہا تھا حماقت تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ لیاقت بھی کپڑوں کے موافق ہوتی ہے مگر اس وقت اپنی غلطی ظاہر ہوئی اور یہ معلوم ہوا کہ کپڑے معیار لیاقت نہیں۔

اتفاق سے یہ بات میرے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ میں نے دوسرے جلسہ میں ممبر پر جاتے ہی کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض حضرات ہمارے لباس پر خاص رائے رکھتے ہیں اور میں حُسنِ ظن سے اس کا منشار نیک نیتی سمجھتا ہوں کہ غالباً محبت ہے۔ وہ چاہتے ہوں گے کہ علمار عمدہ اور قیمتی لباس پہن کر وعظ کہا کریں۔ تاکہ سامعین کے قلوب میں ان کی عظمت ہو اور ان کی عظمت سے مضمون کی عظمت ہو۔ مجھے اس منشار پر اعتراض نہیں اور میں اس کے حُسن و قبح (اچھائی برائی) سے اس وقت بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں تسلیم کیے لیتا ہوں کہ علمار کو عمدہ لباس پہن کر ہی وعظ کہنا چاہیئے مگر سوال یہ ہے کہ عمدہ لباس آئے کہاں سے؟ ہمارے پاس تو اتنا روپیہ نہیں کہ آپ کی تجویز اور منشار کے موافق لباس بنائیں تو اس صورت میں اتنا روپیہ کہاں سے آئے

زیادہ روپیہ حاصل کرنے کے جو ذرائع ہیں وہ دو قسم کے ہیں بعض تو شرعاً قبیح ہیں جن کو ہم جائز نہیں سمجھتے جیسے ڈپٹی کلکٹری اور بعض عقلاً بھی قبیح ہیں جن کو نہ ہم جائز سمجھتے ہیں نہ آپ۔ جیسے وعظ کہہ کر اپنی حاجت پیش کرنا جب یہ دونوں ذرائع ناجائز ہیں صرف ایک ذریعہ رہ گیا ہے کہ ہم میں کوئی مدرس ہے کوئی مصنف کوئی محشی کوئی کسی مطبع کا مصحح تو اس صورت میں ہماری مالی حیثیت اسی لباس کی ہوگی جس کو پہنے ہوئے ہیں اور اس سے زیادہ حیثیت بھی ہوتی تب بھی ہم کو یہ کیسے معلوم ہوتا کہ آپ کی منشاء کے موافق کس قیمت کا لباس ہونا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ ہم اس موجودہ لباس سے بڑھیا (عمدہ) لباس پہن کر آئیں اور آپ کی نظر میں وہ بھی حقیر ہو اس لئے اس کی آسان صورت یہ ہے کہ معترض صاحب اپنی منشاء کے موافق نہایت قیمتی جوڑے ہمارے لیے بنا دیں تاکہ جب تک ہم شملہ میں رہیں اسی لباس کو پہن کر وعظ کہا کریں۔ اور اس کا ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جب شملہ سے جانے لگیں گے وہ لباس آپ کے حوالے کر جائیں گے اپنے ساتھ نہ لے جائیں گے۔ تاکہ ہمارے بعد کوئی اور مولوی وعظ کہنے آئے۔ تو آپ اس کو بھی وہ لباس دے سکیں کہ مولانا یہ کپڑے پہن کر وعظ فرمائیے۔ اس میں آپ کا مقصود بھی حاصل ہو جائے گا کہ سامعین وعظ کی نظروں میں قیمتی لباس کی وجہ سے علماء کی عظمت ہوگی اور ہم بھی خرچ کے بارے سبکدوش رہیں گے اور آپ کا بنایا ہوا لباس پھر آپ کے پاس واپس آجائے گا آپ کو ہر مولوی کے واسطے بار بار جوڑا تیار نہ کرنا پڑے گا۔ ایک دفعہ کا بنایا ہوا برسوں کام دے گا۔

اور غالباً معترض صاحب میں اتنی وسعت تو ضرور ہوگی کہ ایک دفعہ ہمارے لیے قیمتی جوڑے تیار کر دیں کیونکہ ہمارا لباس اس شخص کی نظروں میں حقیر ہو سکتا ہے جو مالدار صاحب وسعت ہو کیونکہ دوسرے مقامات پر ہمارے لباس کو کسی نے حقیر نہیں بتلایا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بہت ہی مالدار لوگ رہتے ہیں جن کی نظروں میں ہمارا اچکن کا لباس بھی حقیر ہے تو مہربانی فرما کر وہ لباس ہمارے لیے تیار کرا دیں۔

ہم اس کو پہن کر وعظ کہہ دیا کریں گے اس سے ہمیں انکار نہ ہوگا اور یہاں سے روانگی کے بعد اگر دوسری جگہ بھی ہمارے لباس کو حقیر سمجھا گیا تو وہاں کے لوگوں سے بھی یہی کہہ دیں گے جو آپ سے کہا ہے اگر ان کو قیمتی لباس میں وعظ سننا ہوگا تو وہ بھی اس کا انتظام خود کریں گے آپ کے بنائے ہوئے جوڑے ہم یہیں چھوڑ جائیں گے۔ یہ صورت بھی اس لیے سہل ہے کہ وعظ کہنے والا تو ایک آدمی ہے جو سینکڑوں مقامات پر جاتا ہے تو ایک آدمی کو ہر جگہ کے مزاج کی رعایت کرنا دشوار ہے اور ہر شہر کے آدمیوں کو ایک جوڑا اپنے مزاج کے موافق تیار کر لینا آسان ہے۔ اب میں منتظر ہوں کہ ہمارے واسطے جوڑے تیار ہو کر کب آتے ہیں اگر غیرت ہوگی تو بہت جلد اس کا انتظام کیا جائے گا۔ اس تقریر سے معترضین کی گردنیں جھک گئیں اور نگاہیں نیچی ہوگئیں۔

آج کل لوگوں کا ایسا مزاج بگڑا ہے ان کی نظروں میں صرف قیمتی لباس والے کی عظمت ہوتی ہے۔ ؎ (برکات رمضان وعظ تقلیل الاختلاط ص۲۲۰)

باب ۱۳ ـــــ طرح طرح کے عہدے و خطابات

نااہلوں کو بڑے بڑے خطابات دینا۔

آج کل لوگوں نے اس کے برعکس کر رکھا ہے کہ بڑے بڑے خطابات لے لیتے ہیں خواہ ان کی اہلیت ہو یا نہ ہو۔ حدیث شریف میں ہے اذا مدح الفاسق اهتزله العرش یعنی جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو عرش کانپ اٹھتا ہے اور آج کل اکثر مدرسے فساق ہی کے ہاتھ میں ہیں اور ان کی مدح ہوتی ہے پھر زمین کانپ اٹھتی ہے تو کیوں تعجب کیا جاتا ہے جہاں خطابات اور

فوائد بڑے بڑے دیکھے۔ وہاں کام خاک نہیں دیکھا۔ (دعوات عبدیت ص ۶۲ ج ۴)
آج کل خطابات بہت سستے ہو رہے ہیں حالت یہ ہے کہ جو قدوری بھی نہیں پڑھا سکتے ان کو مولوی کا خطاب مل جاتا ہے بہت سے شمس العلماء ایسے ہیں کہ اگر ان کے سامنے کوئی چھوٹی سی کتاب بھی پڑھانے کے لئے رکھ دو تو نہ پڑھا سکیں میں تو ایسے لوگوں کو شمس مکسوف کہا کرتا ہوں۔ تعجب ہے کہ لوگ یہ بھی تو نہیں دیکھتے کہ حکام کا کسی کو کوئی خطاب دے دینا کہاں تک کمال کی حجت ہے۔
گورنمنٹ کے خطاب دینے سے کسی کو شمس العلماء سمجھ لینا محض حماقت ہے گورنمنٹ خود ہی شمس العلماء نہیں ہاں شمس السلاطین کہہ دو تو خیر ایسے لوگ صرف و نحو بھی پوری نہیں جانتے اور ہیں شمس العلماء۔ (حقوق الزوجین ص ۳۲۷)

لمبے خطابات والقاب کے نقصانات اور ممانعت کی شرعی وجوہات۔

ان الفاظ کو اختیار مت کرو اس سے برکت نہیں رہتی یہ غیر قوموں کی تقلید ہے من تشبہ بقوم فھو منھم (جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ ان ہی میں سے ہے) یہ حدیث لباس اور وضع ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے جس بات میں مشابہت پائی جائے سب اس کے اندر داخل ہے۔ یہ اچھا ہے کہ تم اپنے آپ کو خادم کہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارا نام سردار رکھا ہے۔ سید القوم خادمھم (قوم کا سردار وہ ہے جو اس کا واقعی خادم ہے) یہ کتنی برکت کا سبب ہے۔
اہل علم کے لئے یہ الفاظ (سیکرٹری وغیرہ) زیبا نہیں دیتے سچ کہتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تشریف رکھتے ہوتے تو ان

الفاظ سے ضرور منع فرماتے لفظ راعنا تک سے قرآن شریف میں نہی موجود ہے صرف اس وجہ سے کہ کفار کی مشابہت لازم آتی ہے۔

چہ جائیکہ یہ الفاظ ایسے ہیں کہ ان میں مشابہت کے علاوہ ترفع اور تجبر بھی ہے۔ اگر فرض کر لیجئے کہ کفار کی مشابہت بھی نہ ہوتی تب بھی ترفع و تجبر کا وجود ہی ان کے لئے کافی تھا۔

کیا ممبر اور گورنر ہی الفاظ رہ گئے ہیں۔ اگر ضرورت ہے تو اپنے قرآن شریف میں سے تلاش کر لو۔ فرماتے ہیں شاور ھم فی الامر۔ اس آیت سے رائے دینے والوں کا نام مشیر اور مکان کا نام مجلس شوریٰ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یہ الفاظ ممبر اور کمیٹی کا کام بخوبی دے سکتے ہیں پھر کیوں دوسروں کی شاگردی کی جائے۔

(دعوات عبدیت حقوق القرآن ص ۶۲، ۶۴ ج ۳)

اونچے اونچے لمبے چوڑے القاب سے اجتناب

آج کل لوگوں کو یہ خبط بھی ہو گیا ہے کہ جب کوئی کام شروع کریں گے تو اس کے لیئے نام بھی کوئی نیا اور نرالا تجویز کریں گے۔ (الفصل للوصل ص ۱۹۰)

ایک صاحب نے لفافہ پر حضرت کے نام سے پہلے حضرت الامام لکھا تھا ناگواری کے ساتھ فرمایا لوگ نئے نئے لفظ لکھتے ہیں جو امام تھے ▪▪ تو خود کو مقتدی نہ سمجھتے تھے۔

ایک طالب علم نے عرض کیا کہ اس کی ایک توجیہ سمجھ میں آتی ہے۔ کہ آج کل لوگوں نے نااہلوں کو حضرت اور مولانا لکھنے کا التزام کر رکھا ہے اور وہ عام ہو گئے ہیں۔ اب اگر اہل کمال حضرات کے لئے بھی یہی الفاظ لکھے جائیں تو التباس ہوتا ہے۔ اس لیے اعلیٰ الفاظ استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

فرمایا چند روز میں یہ بھی عام ہو جائیں گے۔ اس نے عرض کیا اور تلاش

کر لیے جائیں گے فرمایا وہ بھی عام ہو جائیں گے تو کہاں تک تلاش ہو گی یہ سب تکلف ہے۔

نسبتی نام

فرمایا آج کل نسبتوں کا بہت کا بہت رواج ہو گیا ہے جیسے فاروقی چشتی وغیرہ مجھے تو برا معلوم ہوتا ہے چاہے تفاخر کی نیت نہ ہو مگر صورت تو ضرور ہے۔ (الفصل للوصل ص ۱۹۷)

شیر پنجاب اور بلبل ہند جیسے القاب

آج کل زمانہ عجیب طرح کا ہے کہ لوگ ہندوستان اور پنجاب کے جانور بنا چاہتے ہیں کوئی شیر پنجاب بنتا ہے کوئی طوطی ہند کوئی بلبل ہند۔ لوگ انسان سے جانور بننا چاہتے ہیں خدا خیر کرے آج تو شیر اور بلبل بنتے ہیں کل کو کوئی گاؤ ہند اور خر ہند بھی بننے لگے گا کیا واہیات ہے خدا نے تم کو انسان بنایا ہے تم چرند پرند کیوں بنتے ہو۔ (التبلیغ ص ۱۵ ج ۷)

خادم العلماء والفقراء لکھنا

فرمایا بعض لوگ اپنے کو خادم العلماء لکھتے ہیں مگر عوام کی طرف سے ایسا لکھا جانا صحیح تو ہے مگر دھوکا ہوتا ہے مولوی ہونے کا۔
اور خادم الفقراء تو لکھنا اس سے بھی زیادہ سخت ہے اس کا تو یہ مطلب ہے کہ میں درویش ہوں۔ (حسن العزیز ص ۳۸۱ ج ۴)

اشرفی رشیدی قاسمی وغیرہ لکھنا۔

ایک مرض یہ ہے کہ ہماری جماعت کے لوگ اپنے نام کے ساتھ رشیدی، قاسمی، خلیلی، محمودی لکھنے لگے اور بعض کوڑی ہو کر اپنے کو اشرفی لکھتے ہیں اس میں شائبہ شرک تو نہیں مگر تحزب اور پارٹی بندی ہے اور حنفی اور شافعی لکھنے میں جو حکمت ہے وہ یہاں نہیں ہو سکتی کیونکہ وہاں اہل زیغ سے احتراز مقصود ہے یہاں کس طرح احتراز مقصود ہے کیا اس جماعت میں بھی تمہارے نزدیک صاحب زیغ ہے جس سے امتیاز کا قصد کیا جاتا ہے (تا مل سے) ہماری جماعت کے اندر بھی ایک شائبہ شرک کا چلا ہے کہ خطوط میں یا امداد اللہ اور ہوالرشید لکھتے ہیں۔ اگر اس سے حاجی امداد اللہ صاحب اور حضرت مولانا گنگوہی کے نام سے استعانت و تیمن (برکت) مقصود نہیں تو اس کی کیا وجہ کہ بعون اللہ اور ھو اللہ کو چھوڑ کر امداد اور رشید کا لفظ اختیار کیا گیا۔ کیا خدا کا نام رشید ہی رہ گیا ہے اور بھی بہت سے اسماء ہیں مگر ان میں پیر کے نام کی طرف اشارہ کیوں ہوتا۔ بس یہی شائبہ شرک ہے گو شرک نہ ہو۔ (جمال الجلیل ملحقہ جزاء وسزاء صـ۳۳)



باب ۵ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فصل ۱

مُصنفین کی اہمیت اور دار التصنیف والتالیف کے قیام کی ضرورت۔

فرمایا کہ مولوی حبیب احمد صاحب کیرانوی مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون میں طالب علموں کو پڑھانے کے لئے آئے تھے۔ مگر اب میں نے ان کو درس کے کام سے نکال کر تصنیف کے کام میں لگا دیا ہے اس کی آج کل سخت ضرورت ہے۔ مدرس تو بہت ہیں مصنف بھی ہونے چاہئیں۔ یہ کام اگر علماء اپنے ہاتھ میں لے لیں تو غیر علماء کو (مصنف بننے کی) ہمت نہ ہو اور نہ کوئی ان کی تصانیف کے سامنے ان کی قدر کرے۔ میرا ارادہ اس شعبہ کو مستقل کر دینے کا ہے۔ اس کی آج کل سخت ضرورت ہے۔ (حسن العزیز صہ۱۶۲ ج ۴)

تصنیف تالیف کی کثرت اُمتِ محمدیہ کے خواص میں سے ہے۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ تصنیف بھی اس امتِ محمدیہ کے خواص میں سے ہے۔ فرمایا واقعی اور دوسری امتوں میں اس شان کی تصنیف نہیں ہوئی ایک ایک حدیث کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا سکتے ہیں اور وسائط کے نام بتلا سکتے ہیں کہ فلاں سے فلاں نے روایت کی ہے اور ان کے حالات بھی بتلا سکتے ہیں کہ کون کس درجہ کا تھا۔ یہ اس مذہب کی خصوصیات میں سے ہے۔

ورنہ کوئی مذہب بھی کسی اپنی مذہبی بات کو اپنے پیشوا تک اس طرح سلسلہ کے ساتھ نہیں پہنچا سکتا۔

اور زیادہ عجیب اس لیے ہے کہ خلفاء اور سلاطین اکثر ان حضرات مصنفین کے مخالف رہے ہیں جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ ان سے امداد تو کیا ملتی اور الٹے مخالفت کا معاملہ رہتا تھا باوجود کسی مادی امداد نہ ہونے کے ایسی عظیم الشان خدمت نہایت عجیب ہے ۔ (افاضات الیومیہ ہفتم ص۳۵۶ ج ۲، ۲)

تصنیف و تالیف کا کام نہایت مشکل کام ہے۔

فرمایا کہ تصنیف کا کام بھی بہت مشکل کام ہے۔ جو کام کرتا ہے وہی جانتا ہے کہ کیا مشکلات پڑتی ہیں۔ آج کل جو اکثر تصنیفات ہیں کہ مصنفین برساتی مینڈک کی طرح امڈ پڑتے ہیں۔ اس وقت ان کا ذکر نہیں ان کا تو یہ قصہ ہے کہ ایک پہلو لے لیا اور رسالہ لکھ مارا چاہے آگے پھر کچھ بھی ہوا کرے۔ ذکر ان مصنفین کا ہے جو محقق ہیں جن کے سامنے ہر پہلو ہے اور ہر جزئی اور کلی پر ان کی نظر ہے اور اس حالت میں پھر تصنیف کرتے ہیں۔ ان کی حالت تصنیف کے وقت ایسی ہوتی ہے جیسے جاں کنی کے وقت ہوتی ہے ۔ (افاضات الیومیہ ص۲۶۲ ہفتم ۱)

میں کوئی چیز نہیں ہوں لیکن حالت یہ ہے کہ جب کبھی کوئی رسالہ لکھتا ہوں تو راتوں کو نیند نہیں آتی پنسل کاغذ پاس لے کر سوتا ہوں اور جو کچھ یاد آتا ہے راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کو لکھتا ہوں ۔ (دعوات عبدیت ص۹۶ ج۲)

کتاب لکھنے کی غرض و غایت

ایک انگریز جنٹ نے حضرت والا سے پوچھا کہ آپ کو تفسیر لکھنے میں

کتنے روپے ملے حضرت والا نے فرمایا کچھ بھی نہیں اس نے بہت تعجب کیا اور کہا پھر اتنی بڑی کتاب لکھنے کی آپ نے محنت ہی کیوں کی۔

حضرت والا نے فرمایا کہ ہم لوگ اس کے قائل ہیں کہ اس زندگی کے علاوہ ایک اور بھی زندگی ہے جس کو آخرت کہتے ہیں۔ میں نے یہ محنت اس توقع پر کی ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ مجھے اس کا عوض اس دوسری زندگی میں ملے گا اور ایک اس سے دنیا کا فائدہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ جب میں دیکھوں گا کہ میرے مسلمان بھائی اس کو پڑھ پڑھ کر فائدہ اٹھا رہے ہیں تو مجھ کو خوشی ہوگی۔

حضرت والا کی یہ تقریر سن کر انگریز پر خاص اثر ہوا۔ اور اس کے برتاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے قلب میں اس جواب کی بہت وقعت ہوئی ہے

(اشرف السوانح ص۴۸)

کتابوں کو رجسٹری کرانا اور حق تصنیف کی بیع کرنا۔

حقوق کی بیع کوئی معنیٰ ہی نہیں۔ حق کوئی متقوم چیز نہیں، یہ سب جہالت ہے۔ (حسن العزیز ص۱۵۱ ج ۴)

حضرت والا نے محض خدمت دین سمجھ کر لوجہ اللہ کتابیں تصنیف فرمائی ہیں اور مقصود دین کی اشاعت ہے اس لیے حضرت والا نے اپنی کسی تصنیف کی نہ خود رجسٹری کرائی نہ کسی دوسرے کو رجسٹری کرانے کی اجازت دی کیونکہ رجسٹری کرنا اور کرانا شرعاً ناجائز ہے۔ حضرت والا نے ایک اعلان بھی شائع فرمایا جو بلفظہ نقل کیا جاتا ہے۔

چونکہ یہاں کی تصانیف پر کسی سے کچھ حق تصنیف وغیرہ نہیں لیا جاتا اس لئے ان کی رجسٹری کرانے کا کسی کو حق نہیں فقط۔ (اشرف السوانح ص۴۸)

حضرت والا کی طرف سے عام اجازت ہے کہ جس تصنیف کو جو چاہے اور

جتنی تعداد میں چاہے چھاپ سکتا ہے۔

اپنی کسی تصنیف سے کبھی قسم کا دنیوی مفاد حاصل نہیں فرمایا یہاں تک کہ کسی کتاب کے طبع ہو جانے کے بعد اس کے نسخہ کے ملنے کی بھی توقع نہیں رکھی چہ جائیکہ شرط۔ البتہ کسی نے محبت سے کوئی نسخہ پیش کیا تو لینے سے انکار بھی نہیں فرمایا۔ (اشرف السوانح ص۴۲)

کتاب پر مصنف کا نام لکھنا

مردوں کے واسطے بھی میں کہتا ہوں کہ کتاب پر مصنف کا نام لکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مقصود خدمت خلق ہے۔ خدمت نام سے نہیں ہوتی تو نام لکھنے میں سوائے شہرت نفس اور نفس پرستی کے کیا ہے۔

غیر مردوں کے لئے چنداں حرج بھی نہیں بلکہ اس میں مصلحت بھی ہو سکتی ہے کہ مصنف کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے سے کتاب کا درجہ اور اس کی روایات کا درجہ متعین ہو جاتا ہے۔ (التبلیغ ص۴۲ ج، کسار النساء)

عورتوں کو اپنا نام پتہ کسی مضمون یا رسالہ میں نہیں ظاہر کرنا چاہیئے

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کو اپنی تصنیف پر نام لکھنے سے کیا مقصود ہوتا ہے اگر ایک مفید مضمون دوسری عورتوں کے کان تک پہنچانا ہے تو اس کے لئے نام کی کیا ضرورت ہے۔ مضمون تو بغیر نام کے بھی پہنچ سکتا ہے پھر نام کیوں لکھا جاتا ہے۔

ایک آفت نازل ہوئی ہے کہ تعلیم یافتہ عورتیں اخباروں میں مضامین دیتی ہیں اور اس میں اپنا نام اور گلی اور مکان کا نمبر بھی ہوتا ہے۔ یہ شاید اس لیے کہ لوگوں میں ان سے خط وکتابت میں میل ملاقات میں دقت نہ ہو۔ نہ معلوم ان کی غیرت کہاں اڑ گئی۔ اور نہ جانے ان کے مردوں کی غیرت کہاں گئی۔ انہوں نے اس کو کیوں کر گوارہ کر لیا یوں کہیے کہ طبیعتیں ہی مسخ ہو گئیں۔

عورت کے لیے تو کسی طرح نام (و پتہ) لکھنا مناسب نہیں۔ عورتوں کو تو کوئی تعلق سوائے خاوند کے کسی سے بھی نہ رکھنا چاہیئے۔" (التبلیغ صٹ ج، صٹ)

عورتیں بھی مُصنّف بن سکتی ہیں۔

ایک لڑکی کی تصنیف کردہ کتاب میرے پاس آئی جس کو میں نے پڑھا تو وہ بہت نافع معلوم ہوئی اس میں کوئی نقصان کی بات نہ تھی مگر اخیر میں مصنف کا پورا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا کہ فلاں فلاں محلے کی رہنے والی۔ میں حیران ہوا کہ اگر تصدیق کرتا ہوں تو پورا پتہ لکھنے کے واسطے بھی سند ہو جائے گی کیونکہ نام اور پتہ وغیرہ سب لکھا ہوا تھا اور تصدیق نہیں کرتا تو سوال ہو سکتا ہے کہ اس میں کون سی بات مضر تھی جس کی وجہ سے تصدیق نہ کی۔ اسی تردد میں تھا کہ ایک ترکیب سمجھ میں آگئی وہ یہ کہ میں نے مصنفہ کا نام کاٹ دیا اور اُس کے بجائے لکھ دیا "راقمہ امۃ اللہ" (اللہ کی ایک بندی) اور تقریظ میں لکھ دیا کہ یہ کتاب نہایت عمدہ ہے۔ اور سب سے زیادہ خوبی اس میں یہ ہے کہ یہ ایسی بی بی کی تصنیف کردہ ہے جو بڑی حیادار ہے کہ انہوں نے اپنا نام بھی اس پر نہیں لکھا۔ یہ ترکیب نہایت اچھی رہی اس واسطے کہ اگر وہ میری تصدیق اپنی کتاب پر چھاپیں گی تو اپنا نام نہیں لکھ سکتیں اور اگر اپنا نام لکھیں گی تو میری تصدیق نہیں چھاپ سکتیں چلو میرا پیچھا چھوٹا۔" (التبلیغ صلا ج ۷)

فصل ۲ :-

کتابوں کے نام نرم اور معنی خیز رکھنے چاہئیں۔

میں نے اپنی کتابوں کے نام نرم رکھے ہیں۔ چھیڑ چھاڑ کا نام اچھا نہیں کتاب کا نام نرم رکھنا چاہیئے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے جس کتاب کو دیکھنا چاہو تو پہلے دیکھو کہ نام کیسا ہے۔ اگر نام مناسب نہیں ہے تو کتاب مت دیکھو۔ پھر تمہید دیکھو۔ اگر تمہید اچھی نہ ہو تو پھر بھی اس کو چھوڑ دو۔
سخت نام رکھنے میں شریعت پر خشونت کا حرف آتا ہے۔ حالانکہ شریعت بڑی شفقت و رحمت کی چیز ہے۔ بعض کتابوں کے نام ہیں "شریعت کا لٹھ" "شریعت کا آرہ" ۔ (حسن العزیز ص۱۷۷ ج ۳)

فرمایا کتابوں کے نام بعض لوگ تو بالکل ہی مہمل رکھ دیتے ہیں ایک صاحب نے ایک کتاب لکھی اس میں کلمات کفریہ جمع کیئے ہیں۔ اور نام رکھا ہے "توپ گالی الہی" یعنی خدا تعالیٰ کو بُرا کہنے اور کفر بکنے کی وعید ۔
(الفصل للوصل وغیرہ ص۲۱۰)

بعض مصنفین کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیوں اس شخص نے تکلیف اٹھائی اور وقت بیکار کھویا۔ نام تک رکھنے کا سلیقہ نہیں۔ آج کل تو ہر شخص مصنف بنا ہوا ہے ۔ (الافاضات ص۶۳ ج)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہیں وصایا میں لکھا یا ہے کہ اگر کوئی کتاب دیکھنا ہو تو پہلے اس کا نام دیکھو مناسب ہے یا نہیں۔ اگر نام مناسب نہ ہو تو وقت ضائع نہ کرو۔
(الفصل للوصل ص۲۱۰)

اہم ملفوظات، فتاویٰ یا کسی مضمون کا نام رکھنا۔

میں ملفوظات کے بھی نام رکھ دیتا ہوں چاہے چھوٹا ہی ذخیرہ ہو اور فتویٰ ہو یا کچھ غرض جو مضمون اہم ہوتا ہے اس کا نام رکھ دیتا ہوں اس طرح کرنے سے اس کا حاصل کرنا سہل ہوتا ہے مثلاً اگر چھپ گیا تو منگانا سہل حوالہ دینے میں آسانی ہوتی ہے۔ اگر کسی اور مضمون میں اس کے حوالہ کی ضرورت ہو تو سہولت ہوتی ہے۔

(الفصل للوصل ص۲۱)

چند نمونے

(۱) احقر نے جب ملفوظات و واقعات قلم بند کرنا شروع کیا تو فرمایا کہ نام کیا رکھئے گا۔ عرض کیا کہ حضور ہی تجویز فرما دیں فرمایا کہ مجھے تو ایسا نام نہیں رکھنا چاہیے لیکن ذہن میں ہے ایک نام بہت اچھا۔ آپ کا نام عزیز الحسن ہے آپ کی تصنیف کا نام حسن العزیز یعنی اپنے عزیز کا حسن کیونکہ اصل حسن تو یہی باتیں ہیں۔ (حسن العزیز ص۱۷ ج ۱)

نام تو ایسے پر لطف اور با معنی تجویز فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ احقر نے ایک انتخاب مثنوی شریف کا کرنا شروع کیا تھا جس کے ایک حصہ میں سوز و گداز کے عاشقانہ اشعار تھے اور دوسرے میں پند و نصیحت کے اشعار جمع کرنے کا ارادہ تھا حضرت نے فرمایا پہلے حصہ کا نام "برق مثنوی" ہوگا کیونکہ اس میں عاشقانہ اشعار ہوں گے اور دوسرے کا "رعد مثنوی" کیونکہ نصیحت آمیز اشعار میں تہدید و ترہیب ہوتی ہے۔ جو رعد کے مناسب ہے اور مجموعہ کا نام سحاب مثنوی ہوگا جس میں برق و رعد دونوں ہوتے ہیں اور ٹائیٹل پر یہ آیت لکھی جائے۔ فیہ ظلمات و رعد و برق اور جو نیک اثر ان

دونوں قسم کے اشتہار کا ہوگا وہ گویا بارانِ رحمت ہوگی ۔ (حسن العزیز ص۱)

فصل ۳ تصنیف و تالیف کے متعلق ضروری ہدایات

چوتھی صورت تالیف و تصنیف ہے خواہ اشتہار ہو یا اخبار ہو یا رسالہ و کتاب ہو اس میں بھی ضرورت وقت کا لحاظ رکھیں اور عبارت میں سلاست اور کفایت کی رعایت ہو ۔ اور اگر اللہ تعالیٰ معاش کی صورت اور سبیل عطا فرما دے تو اپنی تصانیف کی خود تجارت نہ کرے ۔ (اصلاح انقلاب ص۲۳)

تصنیف و تالیف سے متعلق چند کوتاہیاں ۔

اِس میں بھی چند کوتاہیاں ہیں :۔

۱۔ غیر مفید (مباحث اور) فنون میں تصنیف کرنا ۔

۲۔ رد و قدح (بحث و مباحثہ) و مجادلہ کو اپنی تصنیف میں منظم مقصود بنالینا ۔

۳۔ ایسے مباحث لکھنا جن کی ضرورت عوام کو نہ ہو یا عوام کو مشوش (پریشان کرنے والے ہوں) مثلاً کلام یا تصوف کے نازک مسائل ۔ اور اگر خواص کو نفع پہنچانے کی ایسی ہی ضرورت ہو تو خاص زبان میں مثلاً عربی میں لکھے کہ عوام الناس کی نظر تک نہ پہنچے ۔

۴۔ تصنیف کر کے حق تصنیف بیع کرنا ۔

۵۔ محض تجارت کے لئے عوام کے مذاق پسند تصنیف کر کے اس سے روپیہ حاصل کرنا ۔ (حقوق العلم ص۹۴)

کام شروع کرنے کا طریقہ۔

فرمایا کہ جب میں تصنیف کا کام کرتا تھا تو عادت یہ تھی کہ ہر وقت کاغذ پنسل میرے ساتھ رہتے تھے۔ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے کوئی مضمون یاد آگیا فوراً لکھ لیتا تھا۔ آدھی رات کو کوئی چیز یاد آتی تو لکھ کر سوتا تھا کیونکہ بعض اوقات مضمون ذہن سے غائب ہو جاتا تھا پھر سوچنے سے بھی نہیں آتا۔

(مجالس حکیم الامت ص۲۲۸)

مناسب یہ ہے کہ کاغذ اور پنسل جیب میں پڑا رہے جس وقت جو مضمون ذہن میں آئے اُس کا اشارہ لکھ لیا جائے پھر دوسرے وقت ان میں ترتیب دے لی جائے۔ چنانچہ میری جیب میں پنسل اور کاغذ پڑا ہے ورنہ بعض مضامین ذہن میں آتے ہیں اور پھر نکل جاتے ہیں۔ (حسن العزیز ص۱ ج ۲)

مسوّدہ تیار کرنے کا طریقہ۔

خواجہ عزیز الحسن صاحب اشرف السوانح لکھنے کے لئے طویل چھٹی لے کر تھانہ بھون میں مقیم تھے۔ چھٹی ختم ہونے کو آگئی اور کام بہت باقی تھا۔ حضرت (تھانوی) نے فرمایا کہ میں ہمیشہ کہتا تھا کہ مختصر مختصر جو سامنے آئے اس کو لکھ ڈالو پھر جو یاد آتا رہے گا اضافے ساری عمر کرتے رہنا۔ کام اسی طرح ہوتا ہے مگر کوئی بڈھوں کی بات مانتا نہیں جوانی کے جوش میں جب کام لے کر بیٹھتے ہیں تو یہ خیال کرتے ہیں کہ سبھی کچھ کر ڈالیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ (مجالس حکیم الامت ص۲۴۶)

حضرت والا کو کسی مضمون کے تحریر فرمانے میں زیادہ سوچنے کی ضرورت

نہیں پڑتی ۔اکثر بڑے بڑے غامض مضامین کو بھی قلم برداشتہ ہی لکھتے دیکھا گیا اور بعد کو بھی اس میں اضافات و ترمیمات بھی بکثرت فرماتے رہتے تھے حضرت نے یہ اطلاع بھی شائع فرمادی کہ جس مسودے پر میرے دستخط نہ ہوں یا جا بجا میرے ہاتھ کی اصلاح نہ بنی ہوئی ہو وہ میرا نہ سمجھا جائے ۔ (اشرف السوانح صہ۲۴)

حیوۃ المسلمین کے بارے میں فرماتے ہیں کہ مجھے اتنا تعب کسی تصنیف میں نہ پڑا ہوگا کیونکہ صرف اس تصنیف میں یہ ہوا کہ اس کے اکثر مضامین کے دو مسودے کسی مضمون کے تین مسودے تک لکھنے پڑے ۔ (اشرف السوانح صہ۴۷)

یادداشت کاپی اور بیدار مغزی کی ضرورت۔

جب بہشتی زیور کا دسواں حصہ زیر تالیف تھا جس میں عورتوں کی سب بے تمیزیوں کا بھی ذکر ہے اس زمانہ میں جب کسی کے گھر تشریف لے جانا ہوتا تو جہاں بے تمیزی کی بات دیکھنے میں آتی ۔ فوراً اس کو اپنی یادداشت میں لکھ لیتے۔

اسی طرح مشی (ٹہلنے) وغیرہ میں بھی حضرت والا کا ذہن اکثر فارغ نہیں رہتا اکثر مشکل مسائل میں غور و خوض ہی فرماتے رہتے ہیں اور جب کوئی بات سمجھ میں آتی ہے اس کو یادداشت (کاپی) میں فوراً تحریر فرمالینے کا انتظام فرماتے ہیں تاکہ ذہن سے نہ نکل جائے یہاں تک کہ بعض مرتبہ اسی غرض کے لئے جنگل سے لوٹ آئے اور اس مضمون کو قلمبند فرماکر پھر ٹہلنے کے معمول کو پورا کرنے کے لئے جنگل دوبارہ تشریف لے گئے۔

اس کا یہ بھی سبب ہے کہ حضرت والا اپنے دماغ پر کسی بات کے یاد رکھنے کا بار بلا ضرورت کبھی نہ ڈالتے اور کوئی کام ادھار نہیں رکھتے چنانچہ اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ جس وقت جو کام پیش آتا ہے میں اس کو دوسرے وقت پر نہیں ٹالتا فوراً کر ڈالتا ہوں ۔ گو اس میں اس وقت تو تھوڑی تکلیف ہوتی ہے لیکن

فراغت کے بعد بالکل بے فکری ہو جاتی ہے اور پھر بڑی راحت رہتی ہے ورنہ ٹالنے سے پھر کام ہوتا ہی نہیں اور اگر ہو بھی تو برابر فکر دامنگیر رہتی ہے اور جتنا وقت گذرتا ہے وہ کلفت ہی میں گزرتا ہے پھر تھوڑی دیر ہی کی تکلیف ہی کیوں نہ گوارہ کر لی جائے۔ (اشرف السوانح صـ۳۶)

حضرت والا جس زمانہ میں بکثرت کتابیں تصنیف فرماتے تھے اکثر اپنے پاس پنسل اور کاغذ رکھتے تھے اور جس وقت اس کے متعلق کوئی مضمون ذہن میں آتا فوراً اس کو لکھ لیتے۔ بلکہ بعض اوقات رات کو سوتے وقت بھی تکیہ کے نیچے کاغذ اور پنسل رکھ لیتے تاکہ اگر رات کو بھی کوئی مضمون ذہن میں آئے تو فوراً روشنی کر کے اس کے متعلق یادداشت لکھ لی جائے۔ (اشرف السوانح صـ۴۵)

تصنیف و تالیف کی مشکلات تتبع و تلاش

حضرت والا یہ بھی فرمایا کرتے ہیں کہ بعض تصانیف میں کسی بہت ہی مختصر سی بات معلوم کرنے کے لئے بعض کتابوں کو دوسرے مقامات سے بڑا اہتمام اور خرچ کر کے منگوایا گیا اور اس کی مدد سے ایک ذرا سی عبارت لکھ کر ان کو فوراً واپس کر دیا گیا۔ اب ذرا سی عبارت دیکھنے والا یوں ہی پڑھتا چلا جائے گا لیکن اس کو کیا خبر کہ اس کے لکھنے میں کتنا اہتمام کیا گیا تھا۔
(اشرف السوانح صـ۴۶ ج۲)

غور و فکر اور دعا

تفسیر بیان القرآن کے بعض بعض مقامات کی تفسیر لکھنے کے قبل آدھ آدھ گھنٹہ ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہا تب کہیں جا کر شرح صدر ہوا اور جن بعض مقامات کے متعلق پھر بھی شرح صدر نہ ہوا۔ وہاں

انس کا اظہار کر دیا اور لکھ دیا کہ اگر اس سے بہتر تفسیر کہیں مل جائے تو اسی کو اختیار کیا جائے چنانچہ تفسیر میں دو مقامات ایسے ہیں ایک سورۂ برات میں ایک سورۂ حشر میں ۔ (اشرف السوانح ص۴۶)

انضباط اوقات اور پابندی کی ضرورت۔

انضباط اوقات میں بڑی برکت ہوتی ہے کوئی کام مشکل نہیں رہتا ۔ (حسن العزیز ص۵۴۶ ج ۱)

حضرت والا انضباط اوقات کے یہاں تک پابند ہیں کہ جب حضرت والا کے استاد مکرم جناب مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لا کر مہمان ہوئے تو حضرت والا نے حضرت مولانا کے لئے راحت و آرام کے سارے انتظامات فرما دینے کے بعد جب تصنیف کا وقت آیا تو نہایت ادب کے ساتھ اجازت حاصل فرما کر تصنیف کے کام میں مشغول ہو گئے گو پھر دل نہ لگا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد حاضر خدمت ہو گئے لیکن بالکل ناغہ اس روز بھی نہ کیا ۔ (اشرف السوانح ص۴۶)

ناغہ کی بے برکتی۔

ناغہ کی بڑی بے برکتی ہو جاتی ہے چاہے تھوڑا ہی سا ہو لیکن ناغہ نہ کرے میں بھی جب کوئی مضمون یا کتاب لکھتا ہوں تو ناغہ نہیں کرتا بعض روز بالکل فرصت نہ ملی تو برکت کے لئے صرف ایک ہی سطر لکھ لی اس سے تعلق قائم رہتا ہے ورنہ اگر ناغہ ہو جائے تو پھر بے تعلقی ہو کر مشکل سے دوبارہ نوبت آتی ہے ۔ (حسن العزیز ص۵۴۶ ج ۱ ملفوظ ۵۴۱)

۲۰۱

کام کا جذبہ اور عملی تقاضہ قابل قدر ہے۔

مولوی شبیر علی صاحب نے جو کہ مثنوی شریف کے روزمرہ کے سبق کو ساتھ ساتھ لکھتے جاتے ہیں گرمی اور ضعف دماغ کی وجہ سے چاہا کہ فی الحال صرف نوٹ لکھ لیا کریں بعد میں شرح لکھ لی جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ سہولت اور مصلحت دیکھ لو کام میں جب تک عملی تقاضا نہ ہو تساہل ہو جاتا ہے۔ ابھی تو یہ ہے کہ روز کا سبق روز پورا کرنا پڑتا ہے۔ اگر یہ التزام چھوڑ دیا جائے گا تو پھر عملی تقاضا نہ رہے گا بعد میں پورا کرنا دشوار ہوگا۔

(حسن العزیز صـ۵۴۶ ج ۱)

کام کی دھن اور حضرت تھانویؒ کا حال

فرمایا کسی کتاب یا تصنیف کے ختم کے قریب مجھ کو بہت تقاضا ہوتا ہے۔ چنانچہ مثنوی شریف کے حصہ ششم کے اخیر ربع کی شرح کو صرف دس دن میں ختم کر دیا حالانکہ اوسط ہر ربع کا ایک مہینہ کا تھا جس دن ختم کیا ہے اس دن تمام شب برابر لکھتا رہا اور پھر ظہر کی اذان تک لکھا یہاں تک کہ ختم کر کے ہی اٹھا آج کل نوجوانوں کی ہمتیں ہی پست ہیں۔ ورنہ اگر ہمت کریں تو حق تعالیٰ خود مدد فرماتے ہیں الحمدللہ مجھے کوئی کام دشوار نہیں معلوم ہوتا ہمت کر کے لے بیٹھتا ہوں تو حق تعالیٰ پورا ہی فرما دیتے ہیں۔ ۱۴۱

(حسن العزیز صـ۵۴۹ ج ۱)

حضرت والا کے اندر کام سے جلد فراغت حاصل کرنے کا تقاضا فطری ہے۔ حضرت والا کے اندر کسی کام کو شروع کر کے اس سے اپنے

قلب کو فارغ کرنے کا تقاضا اس شدت سے پیدا ہوجاتا ہے کہ جب تک اس سے بالکل فراغت حاصل نہیں فرما لیتے چین ہی نہیں پڑتا رات دن وقت بے وقت (بہ استثنار امور ضروریہ) اسی کی دُھن میں لگے رہتے ہیں اور اس کو جلد از جلد پورا ہی فرما کر دم لیتے ہیں۔

چنانچہ جب کلید مثنوی ختم کرنے کے قریب پہنچی تو اس سے فراغت حاصل کرنے کا اس شدت سے تقاضا ہوا کہ اخیر میں دن بھر اسی کو لکھتے رہے۔ ایک منٹ کے لئے بھی نہ سوئے اور فجر سے قبل اس کو ختم کر کے چھوڑا اور فرمایا کہ پوری رات جاگنے کا پہلا اتفاق ہوا خلاف عادت ہونے کی وجہ سے بخار ہوگیا لیکن بخار میں بھی ایک اطمینانی کیفیت تھی کیونکہ کام سے فارغ ہونے کے بعد بخار آیا تھا۔ (اشرف السوانح ص۴۴ ج ۲)

غلو اور زیادہ کاوش سے احتراز

چوتھا سبب حضرت والا کی کثرت تصانیف کا عدم غلو ہے چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک بار یہی رائے ظاہر فرمائی تھی۔ حضرت والا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی رائے کو نقل فرما کر فرمایا کرتے تھے کہ بالکل صحیح فرمایا۔ زیادہ کاوش سے کچھ کام نہیں ہوتا۔ میری نظر تو صرف ضرورت پر رہتی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کاوش کرنے سے بہت جی الجھتا ہے اسی وجہ سے میری عبارت بہت مختصر ہوتی ہے۔ مگر اظہار مدعا کے لئے کافی ووافی ہوتی ہے اور واضح بھی ہوتی ہے بلا ضرورت میں ہرگز تطویل نہیں کرتا مگر جہاں موضوع کے لئے تطویل ہی کی ضرورت ہو وہاں تطویل سے بھی گریز نہیں کرتا۔

(اشرف السوانح ص۴۵ ج ۲)

سلف صالحین کی مخالفت اور اُن سے بدگمانی کرنے سے احتراز۔

(۱) فرمایا کہ اہل علم کے کام کی ایک بات بتلاتا ہوں کہ دین پر عمل کرنے کا مدار سلف صالحین کی عظمت پر ہے اس لئے حتی الامکان ان پر اعتراض وتنقیص کی آنچ نہ آنے دینا چاہیئے۔ (الافاضات ص۲۶۵ ج ۲)

میں نے بیان القرآن میں یہ بھی التزام کیا ہے کہ تفسیر تو وہی لکھی جو خود میری سمجھ میں آئی لیکن جب تک اس کی تفسیر سلف صالحین کی تفاسیر سے نہیں ملی اس پر اطمینان نہیں کیا اس التزام میں وقت بھی بہت صرف ہوا اور ہر مقام کے لئے بہت سی تفاسیر کو دیکھنا پڑا اور دیکھنے والوں کو اس کی خبر بھی نہیں کی اور جہاں اپنی تفسیر کی کوئی صریح تائید سلف سے باوجود تلاش کے نہیں ملی۔ وہاں بھی رکھا میں نے اپنی ہی تفسیر کو لیکن اس کے آگے یہ لکھ دیا کہ ھذا من المواھب۔

اس صورت میں تفسیر بظاہر تو سلف کی تفاسیر سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہ سرتاسر خود حضرت والا ہی کی تفسیر ہے۔

(اشرف السوانح ص۴۰)

اصل مضمون اور مسودات کو محفوظ رکھنا۔

حضرت والا مثل دیگر امور ضروریہ کے اپنی تصانیف کے متعلق بھی احتیاط اور اہتمام کا التزام رکھتے ہیں چنانچہ ہر چھوٹی بڑی تصنیف یا تحریری مضمون کے ناموں کی بالالتزام اپنے پاس یادداشت رکھتے ہیں اور وقتاً

نوتناً شائع فرماتے رہتے ہیں مکمل فہرست محفوظ رہنے کی بڑی مصلحت یہ بھی ہے کہ اس صورت میں کوئی غلط طور پر حضرت والا کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ حضرت والا ایک عام اطلاع شائع فرما دی کہ جس مسودے پر میرے دستخط نہ ہوں یا جا بجا میرے ہاتھ کی اصلاح بنی ہوئی نہ ہو وہ میرا نہ سمجھا جائے۔

(اشرف السوانح ص۴۸)

فصل ۴ تصحیح الاغلاط و ترجیح الراجح کا سلسلہ

اپنی غلطی واضح ہو جانے کے بعد اس سے رجوع کرنا اور اس کا اعلان کرنا۔

مجھ کو اپنے فہم یا تحقیق پر وثوق تو کبھی نہیں ہوا مگر اس کے ساتھ ہی اپنے ساتھ اتنی بدگمانی بھی نہ تھی کہ از خود اپنی زلات (لغزشوں) و اغلاط کی تفتیش کا اہتمام کرتا۔ البتہ اگر کبھی اتفاقاً کسی نے کسی غلطی کی اطلاع دی تو بحمد اللہ فوراً رجوع کر لیا اور کسی نہ کسی موقع پر اس کو شائع کر دیا چنانچہ میری تحریرات سے یہ بات ظاہر ہے۔

خصوصاً امداد الفتاوی کے بعض حصص کے اخیر میں ایک طویل فہرست اس کی بھی ملحق ہے۔ پھر جب ان تنبیہات کی مقدار معتدبہ ہو گئی تو مصلحت معلوم ہوئی کہ اس کا ایک مستقل سلسلہ جاری رکھا جائے چنانچہ ترجیح الراجح کی یہی حقیقت ہے۔ (اشرف السوانح ص۱۲۳ ج ۲)

حضرت والا کی اعظم خصوصیات میں سے یہ ہے کہ اپنی تصانیف کے تسامحات کو جن کا علم خود یا کسی دوسرے کے ذریعے ہوتا رہتا ہے۔

ان سے رجوع فرماتے رہتے ہیں اور اس رجوع کو شائع بھی فرماتے رہتے ہیں اور اس سلسلہ کا ایک خاص لقب بھی۔
"ترجیح الراجح" تجویز کیا گیا ہے جو مستقل طور پر جاری ہے اس سلسلہ میں جہاں حضرت والا کو اپنے تسامح پر شرح صدر ہو جاتا ہے وہاں رجوع فرما لیتے ہیں اور جہاں تردد رہتا ہے وہاں جواب لکھ کر یہ تحریر فرما دیتے ہیں کہ دیگر علماء سے بھی تحقیق کر لی جائے۔
اس سلسلہ کے متعلق ایک مولوی صاحب سے حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا یہ قول احقر نے سنا ہے کہ ترجیح الراجح اس زمانے میں بالکل ایک نرالی چیز ہے۔ یہ سلف صالحین کا معمول تھا مولانا تھانوی کی امتیازی شان اور کمال صدق و اخلاص کے ظاہر کرنے کے لیے بس یہ کافی ہے۔ (اشرف السوانح ص۴۹ ج ۲)

غایت احتیاط۔ دوسرے علماء سے نظرِ ثانی کروانا۔

پھر خیال ہوا کہ یہ کیا ضروری ہے کہ ہر لغزش پر کوئی نہ کوئی متنبہ بھی کر دیا کرے تو اس صورت میں بہت سے زلات (لغزشیں) اصلاح سے رہ جائیں گے اس لیئے اس کا یہ اہتمام کیا گیا کہ اہل علم میں سے ایسے متدین و معتمد علماء علماً و عملاً حضرات کو جو نہ میری رعایت کریں اور نہ خواہ مخواہ کا عناد کریں۔ اپنی تمام مولفات پر نظر ثانی کرنے کے لیئے منتخب کر کے ان کو یہ کام سپرد کیا گیا کہ ایسے مواقع میں پوری تحقیق اور آزادی سے کام لے کر ایسے زلات کی تصحیح فرما دیں۔ چنانچہ نہایت خوبی سے یہ کام ہو رہا ہے۔
میری وصیت ہے کہ اگر میرے سامنے یہ کام مکمل نہ ہو تو میرے بعد بھی اس کو جاری رکھیں۔ (اشرف السوانح ص۳۲ ج ۲)

اگر کوئی کتاب کا رد لکھے۔

فرمایا جب کوئی شخص میری کتاب کا رد لکھتا ہے تو جب وہ (رد) میرے پاس آتا ہے تو اول نظر میں خیال یہی ہوتا ہے کہ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے اس کو اسی نظر سے دیکھتا ہوں کہ مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے تاکہ اس سے رجوع کر کے تصحیح کر دوں۔ اس کا جواب دینے کی نیت سے نہیں دیکھتا۔ (مجالس حکیم الامت ص۱۶۸)

حضرت گنگوہیؒ کا حال

سید الطائفہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ قدس سرہ نے جب رد بدعات پر کچھ رسالے لکھے تو اہل بدعت سے سب وشتم کی بوچھاڑ شروع ہوئی بعض مشہور اہل بدعت کی طرف سے بہت سے رسالے ان کے خلاف سب وشتم سے بھرے یکے بعد دیگرے شائع ہوتے تھے حضرت گنگوہیؒ کی بینائی اس وقت نہیں رہی تھی مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی صاحب حضرت کے خادم خاص اور معتمد تھے آنے والی ڈاک کو پڑھ کر سناتے تھے اور پھر جواب لکھنے کی خدمت انہیں کے ذمہ تھی ان میں وہ رسالے بھی ہوتے تھے جو ان حضرت کی طرف سے آتے تھے۔

کچھ دن ایسے گزرے کہ مولانا محمد یحییٰ صاحب نے کوئی رسالہ نہیں سنایا تو حضرت گنگوہی نے پوچھا کہ مولوی یحییٰ صاحب کیا ہمارے دوست نے ہمیں یاد کرنا چھوڑ دیا ہے؟ بہت دنوں سے ان کا رسالہ نہیں آیا۔

مولوی یحییٰ صاحب نے عرض کیا کہ رسالے تو کئی آئے مگر وہ مجھ سے پڑھے نہیں جاتے حضرت نے فرمایا کیوں؟ عرض کیا اُن میں تو گالیاں بھری ہیں۔ آپ

سنے پیسے تو فرمایا ارے میاں کہیں دودھ کی گالی بھی لگا کرتی ہے ؟ پھر فرمایا کہ وہ ضرور سنائیں ہم تو اس نیت سے سنتے ہیں کہ ان کی کوئی بات قابل قبول ہو تو قبول کریں اگر ہماری کسی غلطی پر صحیح تنبیہ کی گئی ہو تو اپنی اصلاح کریں ۔ (مجالس حکیم الامت ص۲۲)

کتابوں میں واقع شدہ لغزشوں سے متعلق دو قاعدے

تالیفات کے بعض مقامات میں مجھ سے کچھ لغزشیں بھی ہوئی ہیں جو اس وقت ذہن میں -امر بھی ان کے دو قاعدے عرض کرتا ہوں ۔

ایک یہ کہ میری کسی ایسی تصنیف میں جو محل لغزش سے متاخر مؤخر ہو اس کی اصلاح کر دی گئی ہو ۔

اور متأخر (مؤخر) ہونا تاریخ کے ملانے سے جو کہ ہر تصنیف کے آخر میں التزاماً لکھی گئی ہے معلوم ہو سکتا ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم کر لینا چاہیئے کہ میری تالیفات میں جو مضمون متعارض ہو اس میں اخیر کا قول میرا سمجھا جائے گا

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ ایسے مواقع مشتبہہ کو دوسرے علماء محققین سے تحقیق کر لی جائے اور ان کے قول کو میرے قول پر ترجیح دی جائے ۔

اسی طرح اگر میرا لکھا ہوا کوئی مشتبہ فتوی کسی کے نظر سے گزرے اس میں بھی یہی تقریر معروض ہے ۔ کیونکہ بعض اوقات لکھنے کے بعد خود مجھ کو بعض سے جوابوں کا غلط ہونا محقق ہوا ہے ۔ میں نے سائل کا پتہ معلوم ہونے پر اس کو مطلع بھی کر دیا ہے لیکن پتہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں غلطی میں پڑنے کا احتمال ہو سکتا ہے اس لیئے احتیاطاً یہ عرض کیا گیا ۔ (اشرف السوانح ص۱۱۲)

━━━⁂━━━

فصل ۵ ـــــــ کتابوں کی تقریظ لکھنا

آج کل یہ بھی پیسے کمانے کی ایک ترکیب ہے کہ علماء کے پاس ایسی کتابیں بھیجی جاتی ہیں اور ظاہر میں یہ کہا جاتا ہے کہ اگر ان میں کوئی نقص ہو تو اس کی اصلاح کر دی جائے۔ اصلاح تو جیسی مقصود ہوتی ہے معلوم ہے اصلی غرض یہ ہے کہ ان پر تقریظ لکھ دی جائے۔ تاکہ زیادہ اشاعت ہو سکے چنانچہ بعض با اخلاق علماء تقریظ لکھ بھی دیتے ہیں۔

مگر میں کہتا ہوں کہ یہ سخت غلطی ہے کیونکہ اس سے ان کو اس بیہودہ تعلیم کی تائید مل جاتی ہے۔ مجھ سے کوئی پوچھے تو ان کتابوں کی اصلاح یہ ہے کہ ان سب کتابوں کو جمع کر کے ایک دم جلا دیا جائے کیونکہ ہر چیز میں اعتبار غالب کا ہوا کرتا ہے اور ایسی کتابوں میں غالب شر ہی ہے اور شر کا علاج یہی ہے کہ سب کو جلا دو۔ (التبلیغ ص۶۹ ج ۷)

تقریظ لکھنے کی بابت حضرت تھانویؒ کا معمول۔

حضرت والا کسی کتاب پر تقریظ محض اجمالی مطالعہ پر نہیں تحریر فرماتے کیونکہ اس کو ناجائز سمجھتے ہیں اور اگر تفصیلی مطالعہ کی فرصت نہیں ہوتی تو کسی ایک مقام کی تعیین کرا لیتے ہیں اور اسی کے متعلق تقریظ تحریر فرما دیتے ہیں اور اس صورت میں جس پر اطمینان ہوتا ہے اس مقام کی تقریظ میں یہ اضافہ بھی تحریر فرما دیتے ہیں کہ امید ہے کہ بقیہ کتاب بھی ایسی ہوگی۔

اور تجربہ کے قبل احیاناً اس معمول کے خلاف بھی ہوگیا ہے مگر بعد میں اس کتاب کی غلطیوں پر مطلع ہونے پر بہت افسوس ہوا اور اپنی تقریظ سے رجوع کا اعلان شائع فرما دیا۔ (اشرف السوانح ص۹)

مضمون کیسے رسالے میں نکالیں

سندھ سے ایک خط حضرت مدظلہ العالی کی خدمت میں آیا کہ یہاں سے ایک اخبار نکلنے والا ہے اس میں یا تو اپنا مضمون دیا کیجئے یا کوئی اپنا وعظ دے دیجئے کہ وہی تھوڑا تھوڑا نکالا جائے اس پر حضرت والا نے فرمایا کہ جب تک پرچہ کی حالت نہ دیکھ لی جائے کہ اس میں کس قسم کے مضامین نکلتے ہیں اس وقت تک اپنا مضمون دینا مناسب نہیں۔ کیونکہ مضمون کے ہونے سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ اخبار ان کا بھی پسندیدہ ہے تب ہی تو مضمون اس میں طبع ہوا۔

(حسن العزیز ص۱۳۵ ج ۲)

ملفوظات ومواعظ

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ملفوظات ضبط کرنے کا اہتمام نہ کرو اس کی کوشش کرو کہ تم ایسے ہو جاؤ کہ تمہارے منہ سے بھی وہی نکلنے لگے جو ان بزرگوں کے منہ سے نکلا۔ (الفصل للوصل ص۱۹۷)

ایک بار فرمایا سوانح عمریاں لکھنے سے اتنا نفع نہیں ہوتا جتنا کہ ملفوظات کے لکھنے سے ہوتا ہے۔ (حسن العزیز ص۲ ج ۱)

بزرگوں کے ملفوظات ومواعظ کا مطالعہ کیا جائے۔ بزرگوں کی تصانیف اور ان کے ملفوظات میں بھی وہی اثر ہوتا ہے جو ان کی صحبت میں ہوتا ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہے کہ بزرگوں کی تصانیف میں تقریباً

وہی نفع ہوتا ہے جو ان کے پاس رہنے سے ہوتا ہے گو بالکل اس کے برابر نہ ہوگا مگر اس کے قریب ضرور ہوگا۔

۱۸۱ جب پھولوں کا موسم نہ جائے تو اب اس کی خوشبو گلاب سے حاصل کرنی چاہئے، گلاب میں بھی پھول ہی کی خوشبو مل سکتی ہے۔ اسی طرح آفتاب چھپ جائے تو اب چراغ سے روشنی حاصل کرنی چاہیئے یہ مشاہدہ ہے کہ اہل اللہ کے کلام میں نور ہوتا ہے۔

عورتیں بزرگوں کے ملفوظات اور احوال جو موجود ہیں ان کو دیکھتی رہا کریں اور مردوں کو بھی بزرگوں کی تصانیف اور ان کے ملفوظات واحوال کا مطالعہ کرتے رہنا چاہیئے۔ (حقوق الزوجین صـ۱۲ وعظ الکمال فی الدین للنساء)

حضرت تھانویؒ کی مجلس کی برکت اور اس کے فائدے

فرمایا اگر یہاں پر دو برس کوئی رہ لے تو اور کچھ تو نہیں لیکن انشاء اللہ فہم دین (تفقہ فی الدین) تو اس کو ضرور حاصل ہو جائے گا۔ اور یہی اصل چیز ہے ایک بار فرمایا کہ دین تو اس کا سنبھلے گا ہی انشاء اللہ دنیا بھی اس کی درست ہو جائے گی۔ واقعی حضرت کے یہاں دنیا کے بھی عجیب غریب انتظامات دیکھنے میں آتے ہیں جن کو اگر دستور العمل بنایا جائے تو دنیاوی زندگی بھی نہایت راحت، و آرام سے بسر ہو۔ (حسن العزیز صـ۲ ج۱)

حضرت تھانویؒ کے ملفوظات و مواعظ

(ایک طالب کو تحریر فرمایا) میرے مواعظ کثرت سے دیکھا کرو اس سے انشاء اللہ بہت نفع ہوگا اور جلد ہوگا۔ مواعظ میں خدا کے فضل سے سب

کچھ موجود ہے اور ملفوظات مواعظ سے زیادہ نافع ہیں اس لئے کہ ان میں خاص حالت پر گفتگو ہوتی ہے جو طالب کے لئے بے حد مفید ہے۔ (الافاضات ص۱۱۳ ج۲)

حضرتؒ کی تقریر و تحریر کا فرق۔

فرمایا میری تقریر میں توسعت ہوتی ہے اور تحریر تنگ ہوتی ہے حتی کہ بعض دفعہ میں بھی نہیں سمجھتا۔ احقر کہتا ہے کہ تنگی تحریر کے یہ معنی ہیں کہ وہ مختصر ہوتی ہے نہ یہ کہ وہ مطلب سے بھی تنگ ہوتی ہے کما ہو مشاہد اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اختصار حضرت کی طبیعت میں داخل ہے۔ تحریر میں اگر بسط کیا جائے تو دیر زیادہ لگتی ہے۔ اس واسطے اس میں بسط نہیں فرماتے۔ (حسن العزیز ص۱۴۴ ج۴)

فصل ۔۔۔۔۔۔ سوانح عمری لکھنا

آج کل سوانح عمریوں میں ہوتا ہی کیا ہے سوائے غیر مفید قصوں اور کہانیوں کے۔ حالانکہ دیکھنے کی بات تو یہ تھی کہ مثلاً اس مسئلہ میں ان بزرگ کی تحقیق کیا ہے یا فلاں موقع پر وہ کیا تعلیم فرماتے تھے اب ان باتوں کو لکھتے نہیں غیر ضروری قصے لکھتے ہیں

اور اکثر سوانح عمری لکھنے والوں کی نیت بھی درست نہیں ہوتی بلکہ ایسی باتوں کو سوانح عمری میں درج کرنے سے کبھی تو جاہ مقصود ہوتی ہے کہ ہم ایسے شخص کی طرف منسوب ہیں اور کبھی مال مقصود ہوتا ہے کہ لوگ خوب خریدیں گے۔

مجھ کو ان ہی عوارض کے سبب سوانح عمری سے دلچسپی نہیں اور میں کہتا ہوں کہ سوانح عمری میں کیا رکھا ہے اصل چیز تو یہ ہے کہ جو ان بزرگ میں کمالات تھے ان کی پیروی کی جائے۔

البتہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری بیشک ضروری ہے۔ اس لیے کہ ان واقعات سے احکام ثابت ہوتے ہیں جن کا اتباع کیا جائے پھر ان کے جمع کرنے میں احتیاط کس درجہ کی گئی ہے باقی بزرگوں کے حالات قابل اتباع تھوڑی ہیں۔ (القول الجلیل ص۲۷ ص۲۹)

حضرت تھانویؒ کی وصیت اور فرمان

میں نے کہہ دیا ہے کہ بھائی میری سوانح عمری نہ لکھی جائے میں نے جو کچھ اپنے قلم سے مضامین لکھ دیئے وہی میری سوانح عمری ہے اس میں میری وہ غلطیاں بھی ہیں جو دوسرا معتقد نہ لکھتا میں نے خود اس کو اپنے قلم سے لکھ دیا ہے بس میں تو اس میں خوش ہوں۔ ہمارے بزرگوں کو اس کا اہتمام نہ تھا دیکھ لیجئے حضرت میاں جی یعنی دادا پیر کی سوانح عمری کسی نے نہیں لکھی مولانا یعقوب صاحب کی سوانح عمری کسی نے نہیں لکھی۔ حضرت حاجی صاحب کی سوانح عمری کسی نے نہیں لکھی البتہ مولانا قاسم صاحب کی سوانح عمری مولانا یعقوب صاحب نے لکھی تھی۔ سو اول تو راوی بے شک ایسے تھے۔ دوسرے روایت مختصر لکھی ہے جتنی لکھی ہے مغز ہے۔ (القول الجلیل ص۲۷، ۲۸، ۲۹)

چونکہ محبت میں اکثر مدائح غیر واقعیہ مشہور کر دیئے جاتے ہیں اس لیے میں اپنی سوانح لکھا جانا پسند نہیں کرتا۔ اگر کسی کو بہت ہی بے تابی کا شوق ہو اور دوسرے اہل تدین و تحقیق بھی اجازت دیں تو روایت میں شدید احتیاط کو واجب سمجھنا چاہیئے۔ ورنہ میں بری ہوتا ہوں۔ (اشرف السوانح ص۱۱۱ ج ۴)

سوانح عمری کا نفع۔

بعض احباب نے اس احقر کے کچھ حالات۔ کچھ مقالات ملقب بہ

"اشرف السوانح" اس غرض سے جمع کیے ہیں کہ مطالعہ کرنے والوں کو اور بالخصوص ان میں جو احقر سے دینی تعلق رکھتے ہیں ان کو علمی وعملی نفع ہو اور مدت طویلہ تک جس کی حد اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے باقی رہے۔
اگرچہ میرے حالات ومقالات قابل نفع نہیں نیز پہلے سے ہر قسم کا علمی وعملی ذخیرہ امت کے ہاتھ میں موجود ہے جو جدید ذخیرہ سے مستغنی کرنے والا ہے مگر اس کے ساتھ ہی انا عند ظن عبدی بی (میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوں) کی حدیث کی بنا پر سنت اللہ یہ ہے کہ جس شخص کے ساتھ حسن ظن ہوتا ہے اور اس کے حالات ومقالات سے نفع کا گمان ہوتا ہے اس سے نفع کے حاصل ہونے میں خاص سہولت ہوتی ہے اس موقع پر احقر نے بھی ان کے اس فعل میں مزاحمت نہیں کی۔ گو یہ فعل میری وصیت اور نیز میری طبیعت کے بھی خلاف ہے۔ مگر اسی توقع مذکور پر ان کی مخلصانہ خدمت کو گوارا کرلیا گیا ہے (التبلیغ شکر السوانح ص ۷۹ ج ۲)

سوانح عمری کا ثبوت، (اللہ کی نعمت)

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ
قال اللہ تعالیٰ حکایۃ عن دعاء ابراھیم علیہ السلام واجعل لی لسان صدق فی الاخرین۔

اس وقت میرا مقصود صرف اس آیت کے متعلق بیان کرنا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت حق میں عرض کر رہے ہیں کہ اے اللہ ایک دعاء میں یہ بھی کرتا ہوں کہ میرے نفع کے لیے آئندہ آنے والے لوگوں میں میرا ذکر خیر بالعنوان دیگر نیک نام جاری اور باقی رکھیے۔ ذکر خیر ترجمہ ہے لسان صدق کا ...... ابراہیم علیہ السلام کے دعا مانگنے سے معلوم ہوا کہ بقاء

ذکر خیر فی الآخرین۔

لوگوں میں ذکر خیر اور نیک نام ہونا ایک بڑی نعمت ہے جو طلب کے قابل ہے اور ان دعاؤں کا خالص دینی ہونا ظاہر ہے جس کی طرف کلمہ لی کے لام میں اشارہ قریب صراحتاً ہے کیونکہ لام نفع کے لئے ہے اور ظاہر ہے کہ بعد والوں میں رجو کر آخرین کا مدلول ہے، کسی کا ذکر خیر رہنا کسی دنیوی نفع کا سبب نہیں ہو سکتا پس لامحالہ وہ دین ہی کا نفع ہے اور وہ ثواب ہے یعنی وہ لوگ میرے طریقہ پر چلیں جس پر مجھے زیادہ ثواب ملے اسی کو ایک آیت انا نحن نحی الموتی ونکتب ما قدموا وآثارھم میں آثار سے ظاہر فرمایا چنانچہ حدیث میں من سن سنۃ حسنۃ الخ کی تائید میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس آیت کو تلاوت فرمانا (کما فی الدر المنثور) اس نفع تفسیر بالثواب کی صاف دلیل ہے۔

حاصل یہ ہے کہ یہ بقاء الذکر فی الآخرین (بعد کے لوگوں میں ذکر خیر باقی رہنا) یہ بھی ایک بڑی دینی صنف ہوئی اور نعمت کے تمام افراد مطلوب ہیں کما قال اللہ تعالیٰ واسبغ علیکم نعمہ ظاہرۃً وباطنۃ۔

اور اس مطلوب نعمت کے حاصل کرنے کی مختلف صورتیں ہیں منجملہ ان کے ایک صورت کسی شخص کے حالات ومقالات کی تدوین واشاعت بھی ہے جو عادۃً اس شخص کے مدت دراز تک بقاء ذکر خیر کا ذریعہ ہے اور اس شخص کے ذکر کے لئے دعا کا یہ سبب ہوگا اور سبب ہوگا قابل اتباع افعال میں مسلمانوں کی اقتدار کا اور شہداء اللہ فی الارض کے حسن ظن کی برکت سے سبب ہوگا۔ اس شخص کے جبر نقص (کوتاہیوں کی تلافی) اور عطار کی تکمیل کا۔

(شکر السوانح التبلیغ ص۲۲)

سوانح عمری لکھنے غرض و غایت اور اس کا فائدہ

حدیث میں ہے جو کہ لوح کی عبارت میں مذکور ہے قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اخی الرجل الرجل فلیسئلہٗ عن اسمہ واسم ابیہ وممن ھو فانہ اوصل للمودۃ (ترمذی)

اگر سوانح عمری سے غرض محض محبین کی زیادت معرفت کے واسطہ ہو اور اس کے واسطے سے زیادت محبت ہو تو یہ حدیث لوح کے موافق ہے۔ پھر کوئی وجہ ہی شبہہ کی نہیں۔ (اشرف السوانح صہ ۳ ج ۱)

زندہ شخص کی سوانح عمری لکھنے میں بے احتیاطی کے دو پہلو۔

ایک تو بے احتیاطی ہے کہ زندہ شخص کے متعلق یہ (سوانح) ہے جو اکثر اہل طریق کے معمول کے خلاف ہے جس کی حکمت اس حدیث میں مذکور ہے۔ من کان مستنا فلیستن بمن قد مات فان الحی لا یومن علیہ الفتنہ۔ (جمع الفوائد)

اور اکثر اس لیے کہا گیا کہ بعض اکابر نے خود بھی اپنے سوانح لکھے ہیں جیسے جلال الدین سیوطی اور عبدالوہاب شعرانی رح کما بلغنی عن بعض الثقات۔ اور ایک احتیاط یہ ہے کہ روایت میں افراط و تفریط کا احتمال بہت کم ہو جاتا ہے جس کا وقوع اکثر خوش اعتقادوں کے غلو سے ہو جاتا ہے۔ اور اسی بناء پر میں نے وصیت کے ضمیمہ میں بتاکید منع کیا ہے کہ میری سوانح عمری

نہ لکھی جائے۔

سو اس سے افراط و تفریط کا احتمال کم ہو جاتا ہے کیونکہ صاحب واقعہ اس کی تنقید کر سکتا ہے اور اس مصلحت کے اہم ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔
(اشرف السوانح ص ۲ ج ۱)

سوانح عمری یا ملفوظات کے بیان کردہ فقہی مسائل کی اہمیت۔

ایک معتدبہ حصہ لکھا ہوا دیکھنے پر ایک حکمت یہ بھی مشاہدہ میں آئی کہ واقعات خاصہ کے ضمن میں بہت سے مسائل کی تنقیح ہو گئی ہے اور ان کی تدوین (تنقیح گو مقصوداً بھی ہو سکتی ہے اور ہوئی بھی ہے لیکن واقعات چونکہ ان کے لئے بمنزلہ شواہد کے ہو گئے اس لیے اس طرز سے وہ اوضح واوقع فی النفس (زیادہ واضح اور دلنشیں) ہو گئے۔ آخر کوئی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں عبرتوں اور حکمتوں کے ساتھ قصے بھی ذکر فرمائے گئے ہیں۔ لے (اشرف السوانح ص۷ ج ۱)

ملفوظات اور سوانح لکھنے والے قابل شکر ہیں۔

رسالہ اشرف السوانح میں میرے لیے اس نعمت کا سامان کیا گیا ہے۔ تو اس کی تدوین اور نشر کے داعی میرے لیے وسائط نعمت (نعمت حاصل ہونے کا ذریعہ) ہوئے اور منعم حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کے شکر کے بعد واسطہ نعمت کا شکریہ بھی مامور بہ ہے چنانچہ حدیث میں ہے۔ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ (جس نے لوگوں کا شکریہ نہیں کیا اس نے اللہ کا شکر نہیں کیا) اور

(یہ شکر کا ایک طریقہ ایک حدیث میں دعا اور ثنا کرنا بھی وارد ہے ۔ من صنع الیہ معروف فقال لفاعلہ جزاک اللہ خیرا فقد ابلغ فی الثناء۔ جس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک (احسان) کیا گیا اور اس نے احسان کرنے والے کو دعا میں جزاک اللہ کہہ دیا تو اس نے ثنا کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی (ترمذی) ۱۴۶

اس لیئے میں اس جلسہ میں ایسے صاحبوں کے لیئے دعا بھی کرتا ہوں جو ثنا پر بھی دال ہے (کما سبق فی الحدیث المذکور انفا)

اور دوسرے حضرات سے بھی دعا کی درخواست کرتا ہوں ۔

(التبلیغ وعظ الشکر صہ ۴۹ ج ۲)

تصنیف مقبول ہونے کا راز اور صاحب ہدایہ کی کتاب مقبول ہونے کی وجہ۔

(یہ سب ان حضرات کے خلوص وللہیت کی برکت تھی) ان حضرات کے خلوص کی یہ کیفیت تھی کہ صاحب ہدایہ کی تصنیف جب تک پوری نہیں ہوئی۔ برابر روزے رکھتے تھے اور طرفہ یہ کہ کسی کو روزہ رکھنے کی خبر نہیں ہوئی خدا جانے کتنے سال میں ہدایہ لکھا ہوگا۔ برابر روزہ رکھنا اور کسی کو خبر نہ ہونا کس قدر اخلاص کی بات ہے مردانہ مکان میں بیٹھ کر لکھتے تھے۔ لونڈی (باندی) مکان سے کھانا لاتی تھی اور رکھ کر چلی جاتی تھی۔ جب کوئی مسافر نا آشنا سامنے سے گزرتا اس کو وہ کھانا دے دیتے۔ لیکن چونکہ اپنے مخصوصین سے پردہ نہیں ہوتا۔ اس لیئے تحدیث بالنعمۃ کے طور پر کبھی خاص لوگوں سے یہ قصہ ذکر فرمایا ہوگا۔ اس لیے ہم تک منقول ہوا۔ اس خلوص کی برکت سے ان کو نور فہم عطا ہوا ہے (اور ان کے خلوص کی برکت ہے کہ کتاب اتنی مقبول ہوئی) (دعوات عبدیت صہ ۳۲ ج ۲ ذم ہوی) ۱۴۷

